دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک کا علمی و دینی مجلہ

ماہنامہ

الحق

زیر سرپرستی: شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق بانی و مہتمم دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک ضلع پشاور (مغربی پ

لہٗ دعوۃ الحق

قرآن و سنّت کی تعلیمات کا علمبردار

الحق

ماہنامہ — اکوڑہ خٹک

رجب المرجب ۱۳۸۸ھ

اکتوبر ۱۹۶۸ء

جلد نمبر : ۴

شمارہ نمبر : ۱

اس شمارے میں

نقشِ آغاز	سمیع الحق	۲
ڈاکٹر فضل الرحمٰن کا اسلام	ڈاکٹر فضل الرحمٰن (اقتباسات)	۹
تجدد اور مغربیت	ابوالحسن علی ندوی	۱۹
شیخ الحدیث مولانا نصیر الدین غورغشتی	مولانا قاری سعید الرحمٰن - راولپنڈی	۲۹
اسلام حدیث اور سنت کا مقام	علامہ محمد اسد صاحب - جرمنی	۳۷
رویت ہلال کی شرعی حیثیت	مولانا محمد یوسف صاحب - ماموں کانجن	۴۷
"اسلام" پر ایک نظر	جناب بریگیڈیر گلزار احمد صاحب - راولپنڈی	۵۷
یادِ رفتگان	سمیع الحق	۶۸

بدل اشتراک

مغربی پاکستان :- سالانہ چھ روپے فی پرچہ ۶۰ پیسے

مشرقی پاکستان :- سالانہ بذریعہ ہوائی ڈاک آٹھ روپے، فی پرچہ ۷۵ پیسے

غیر ممالک :- سالانہ ایک پونڈ

کاتب : المعز حسن

سمیع الحق استاد دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک طابع و ناشر نے منظور عام پریس پشاور سے چھپوا کر دفتر الحق دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک سے شائع کیا

۹۸۸۸۲

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ آغاز

خداوند کریم کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ الحق اپنی زندگی کے تین سال پورے کر کے اس شمارہ سے چوتھے سال میں قدم رکھا، زندگی کے اس مختصر سفر میں اسے پھولوں کا بھی سامنا کرنا پڑا اور کانٹوں کا بھی مگر اس رحیم وکریم کی نگاہ کرم کے صدقے اس راہرو حق کے سفر میں کہیں رکاوٹ نہ آئی جو کچھ ہو سکا اسی کے چشمہ فیض کی کرشمہ سازی تھی، آئندہ جو ہوگا اسی کے فضل وکرم کا نتیجہ ہوگا۔ ہمیں اپنے قارئین کی حق نوازی سے امید ہے کہ وہ الحق کی زیادہ سے زیادہ اشاعت، مقاصد وعزائم سے ہم آہنگی اور ہماری لغزشوں سے درگذر کے لیے دست بدعا رہیں گے۔ مقصود اوّل وآخر دین کی اشاعت اور حق وباطل کی تفریق ہے۔ خداوند کریم ہمیں اپنے مقاصد سے بہتر سے بہتر شکل میں ہمکنار ہونے کی توفیق دے۔ وما توفیقی الا باللہ۔

بالآخر پاکستان کے غیور اور جسور مسلمانوں کو فتح ہوئی اور ادارہ تحقیقات کے ڈائریکٹر ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب کو بقول ان کے ملک کو فساد اور انتشار سے بچانے کی خاطر اپنے منصب سے مستعفی ہونا پڑا یا بقول ایک وزیر کے صدر صاحب نے انہیں الگ کر دیا۔ خدا کا شکر ہے کہ اسطرح حکومت اور ملک کو اس صورتحال سے بچا لیا گیا جو کچھ عرصہ اور ڈاکٹر صاحب کے اپنے عہدہ پر قائم رہنے کی صورت میں انتشار اور عالم اسلام میں پاکستان کی بدنامی کا ذریعہ بنتی۔ حکومت کے تدبّر اور سیاسی بصیرت کے ساتھ ساتھ یہ واقعہ یہاں کے کروڑوں مسلمانوں کی دینی حمیّت اعلاءِ حق کے لئے ایمانی جرأت، دین سے سچی محبت اور اسلام کی برتری اور عظمت کی واضح علامت ہے مسلمانوں کا یہ جوش وخروش اور ایمان ویقین کے ولولہ انگیز مظاہرے اس امر کا بیّن ثبوت ہیں کہ ابھی ہماری دینی حس اور ہمارا ایمانی جذبہ اتنا کمزور نہیں ہوا کہ اسلام کو اتنی آسانی سے مسخ کیا جا سکے یہ معاملہ اس امر کا بھی غمازہ ہے کہ اصل طاقت عامۃ المسلمین اور اہل حق کی ہے، حق کا فیصلہ عوام کی عدالت اور اصلی ونقلی اسلام کی تمیز جمہور اسلام کے ہاتھ میں ہے۔ مگر کیا یہی کچھ ہمارے اطمینان کے لئے کافی ہے؟ اور کیا ڈاکٹر صاحب کی علیحدگی جمہور امت کے احساسات کی سچائی اور معقولیت تسلیم کر لینے کا نتیجہ ہے؟ یا پھر وقتی

دباؤ اور عارضی ہیجان کے نتیجہ میں ایسا ہوا ۔؟ اس بارہ میں افسوس کہ ہمیں بڑی مایوسی ہو جاتی ہے ۔ ڈاکٹر صاحب نے جاتے جاتے اپنی غلطی کے اعتراف کی بجائے مسلمانوں کی نیت پر تفرقہ انگیزی اور انتشار پسندی کا حملہ کیا اور پھر ہمارے محترم وزیر قانون ایس ایم ظفر صاحب نے بھی اخباری خبروں کے مطابق اس ملک گیر احتجاج کو علماء کی بے وقت راگنی قرار دیا ۔ اور حیرت یہ کہ اپنی طرف سے ڈاکٹر صاحب کی رسوائے زمانہ کتاب کی صفائی اور ملحدانہ نظریات سے انکی براءت بھی کرنا چاہی یہاں تک کہ ڈاکٹر صاحب کو علماء حق سے بحث و مناظرہ کی پوزیشن میں بھی سمجھا گیا ، اور یہ بھی کہا گیا کہ ڈاکٹر صاحب نے یہ کتاب موجودہ عہدہ سے بہت پہلے لکھی تھی ۔ (اور یہ بات کتاب کو بار بار پڑھنے کے دعویٰ کا عجیب "ثبوت" ہے) کتاب کی صفائی اور ڈاکٹر صاحب کی براءت کا تو ہم اسی شمارہ میں کتاب "اسلام" کے چند اقتباسات اپنے اصل الفاظ (انگریزی) میں پیش کر کے فیصلہ قارئین پر چھوڑتے ہیں ۔ لیکن کیا صرف یہی کتاب تھی جس سے ڈاکٹر صاحب کے نظریات پر روشنی پڑتی ہے ۔ نہیں ، بلکہ ڈاکٹر صاحب تو پچھلے کئی سال سے اسلام کی تحقیق و ریسرچ پر مصروف ہیں وہ اور ان کے رفقاء کار کے سینکڑوں ہزاروں مضامین اور مقالات اسلام کا حلیہ بگاڑنے کے سلسلہ میں اب تک شائع ہو چکے ہیں ۔

ادارہ کا ترجمان ماہنامہ "فکر و نظر" لگاتار اسلام کے اصول اور مبادی پر تیشہ چلا رہا ہے ۔ اس کے صفحات ڈاکٹر صاحب کے ملحدانہ نظریات اور اسکی تشریح و ترجمانی کے لئے وقف ہیں "اسلام" میں انہوں نے جو کچھ کہا اس سے زیادہ شد و مد کے ساتھ اور اس سے بڑھ کر وہ ادارہ کے رسائل میں ہر ماہ پیش کرتے آئے ہیں ۔ ماہنامہ فکر و نظر کے کسی ایک فائل کو اٹھا کر دیکھئے ، آپ کو اس قسم کے تحقیقی شاہکار ملیں گے کہ ـــ قرآن کلام اللہ بھی ہے مگر کلام رسول بھی ہے[1] ۔ قرآنی قوانین وقتی تھے[2] قرآنی زکوٰۃ ٹیکس ہے[3] ۔ قرآنی نصاب شہادت منسوخ ہے[4] ۔ قرآن سے شراب کی حرمت ثابت نہیں ہوتی[5] ۔ حضورؐ کے فیصلے قانون نہیں ہیں[6] حضورؐ کو قانون سازی کا موقع نہ مل سکا[7] معراج مسلمانوں کی توہم پرستی کی ایک مثال ہے[8] عقیدۂ شفاعت عیسائیوں کے عقیدہ کفارہ کا جواب ہے[9] (وغیر ذلک من الخرافات اعاذنا اللہ منہا) ـــ الغرض ادارہ کے نشریات سے ایسے مواد کا دفتر سے دفتر تیار ہو سکتا ہے ، جس میں اسلام کے ایک ایک مسئلہ اور بنیادی امور پر نشتر زنی کی گئی ہو خواہ اس کا تعلق وحی ، قرآن ، رسالت ، سنت اور سیرت سے ہو یا قیاس و اجتہاد سے اسلام کے

---

[1] فکر و نظر جنوری ۶۸ ص ۵۳ [2] ج ۲ ش ۱-۲ ص ۱۶ [3] جنوری ۶۸ نیز ش ۱۲/۱ جون ۶۵ ء [4] ش ۲/۴ ص ۲۳۶ [5] اختلافی نوٹ از مشاورتی کونسل [6] ش ۱-۲ ص ۱۶ [7] ص ۱۰/۱۱ [8] ج ۲ ش ۱ ص ۲۱ [9] ایضاً ۔

معاشرتی اور تمدنی مسائل ہوں یا اقتصادی نظام، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ جیسی بنیادی عبادات ہوں یا طلاق، نکاح، عدت اور میراث کے قوانین۔ اگر ہمارے بیدار مغز اور سنجیدہ و متین وزیر قانون کو اس تمام تحقیقی طومار اور "اجتہادی" سرگرمیوں کا واقعی علم نہ تھا تو ان کے لئے مناسب یہ تھا کہ وہ ڈاکٹر صاحب کی صفائی میں تمام مسلمانوں کی آنکھوں میں یوں دھول نہ جھونکتے، اسطرح انہوں نے بلاوجہ اپنے بارہ میں مسلمانوں کے جذبات اعتماد کو دھچکا لگا دیا۔ تعجب ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی مذکورہ کتاب کو بار بار پڑھ لینے کے باوجود بھی کتاب کے ایسے کھلے جارحانہ حصے ان کی نظر میں کیسے نہ آسکے۔ وزیر صاحب کے بارہ میں ہمارا حسن ظن یہی کہتا ہے کہ وہ ڈاکٹر صاحب کے بارہ میں تساہل یا پھر خوش فہمی کا شکار ہوئے ورنہ ان کے دینی احساسات لامحالہ انہیں ڈاکٹر صاحب کے نظریات سے بیزاری پر مجبور کرتے۔

جو لوگ اس ملک میں جان بوجھ کر ڈاکٹر صاحب جیسے صریح ملحدانہ خیالات رکھنے والے اشخاص کی وکالت کرتے ہیں۔ یہ چیز یا تو ان لوگوں کی حقیقت دین سے بے خبری اسلام کے بنیادی معتقدات سے لاعلمی اور جہالت کی دلیل ہے، یا پھر حقیقی اسلام سے گریز و فرار کا ثبوت یا کم از کم دینی حمیت اور ملی احساسات کے فقدان کی علامت، ورنہ یہ کب ممکن ہے کہ جن لوگوں کی رگ حمیت کسی معمولی سیاسی اختلاف اور تنقید سے پھڑک اٹھتی ہے، اسلام کی اس بے دردی سے توہین پر انکی جبین غرور عرق آلود تک نہ ہو، کسی قومی محترم شخصیت کا نام بغیر القاب و آداب لینے پر تو کھلبلی مچ جائے، ثرستی اور نیم ثرستی اخبارات اداریوں کا طومار باندھ لیں، یہاں تک کہ اقتدار اعلیٰ تک کو اس کی تلافی کرنی پڑے۔ مگر جب ایک سرکاری ادارہ کا ڈائرکٹر نہ صرف یہ کہ آقائے مدینہ مولائے کل (صلی اللہ علیہ وسلم) کے نام کو کسی اعزاز و تکریم اور صلوٰۃ و سلام تک کا روادار نہ ہو بلکہ وہ نبی اولین و آخرین کے منصب رسالت اور تشریعی مقام اور قرآن کریم کی شان و منزلت کو نگاہ مشکوک اور مجروح کرنے کی کوشش کرتا پھرے، تو ان لوگوں کو احساس ندامت تک نہ ہو بلکہ الٹا وہ ناموس رسالت پر مرمٹنے والے اور نظریہ پاکستان کے تقدس کو برقرار رکھنے والے مسلمانوں کے جذبات کو چیلنج کردیں۔ رہا یہ دعویٰ کہ ڈاکٹر صاحب نے مذکورہ کتاب بہت پہلے لکھی گئی تھی تو افسوس کہ یہ بات حقیقت کے خلاف ہے، بلکہ ڈاکٹر صاحب نے اپنی تصنیف میں اول تا آخر ادارہ تحقیقات اور اپنی کتاب کو یک جان دو قالب بنا کر دنیا میں پاکستان کو رسوا کرنے کا بھرپور سامان مہیا کیا ہے۔

ٹائیٹل پر مؤلف کے نام کیساتھ ڈائرکٹر ادارۂ تحقیقات کا عہدہ لکھا گیا ہے۔ سن طباعت ۱۹۶۶ء بتلایا گیا ہے۔ اور پیش لفظ (جس میں ادارہ کے رفقاء کا شکریہ ادا کیا گیا ہے) پر ۱۹۶۵ء کی تاریخ ثبت ہے، پھر کتاب میں جگہ جگہ اسلام کو "نئے تقاضوں سے ہم آہنگ" کرانے کے سلسلہ میں ادارۂ تحقیقات کے عزائم اور مقاصد کو بھی سراہا گیا ہے (ملاحظہ ہو صفحہ ۲۵۲) اس تفصیل سے واضح ہو جاتا ہے کہ کتاب خود اس تاویل کا منہ چڑا رہی ہے، جو جھوٹی تسلی دلانے کے لئے کتاب کے بارہ میں اختیار کی گئی ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ ایسی دل آزار کتاب کے ساتھ ادارۂ تحقیقات کا جوڑ لگا کر بیرون ملک میں پاکستان کی دینی ساکھ کو کافی نقصان پہنچایا گیا ہے۔ جس اسلام کے رشتہ سے مراکش سے لیکر انڈونیشیا تک عالم اسلام کے دل پاکستان کے لئے دھڑک رہے ہیں، یہاں سے اسلام کی ایسی نمائندگی دیکھ کر اس دھڑکن کی رفتار یقیناً سست پڑ جانے کا خطرہ ہے۔ اگر یہ کتاب واقعی موجودہ عہدہ سے پہلے لکھی گئی تھی تو اس بات سے انتظامیہ کی پوزیشن اور بھی نازک ہو جاتی ہے کہ ایسی کتاب کے مصنف اور اسلام کے بارہ میں اتنا معاندانہ رویہ رکھنے والے شخص کو کن اغراض اور مقاصد کی خاطر اتنا اہم آئینی اور مرکزی ادارہ سپرد کر دیا گیا۔ جبکہ اس کے خیالات پہلے سے ڈھکے چھپے نہ تھے۔

اس نازک اور اضطراب انگیز صورتحال کی تلافی صرف ڈاکٹر صاحب کے استعفیٰ دینے سے نہیں ہو سکتی بلکہ ملک و بیرون ملک میں دینی ساکھ اور ملک کی اسلامی حیثیت بحال کرنے سے پاکستانی قوم میں اعتماد اور اطمینان کی فضا پیدا کرنے کے لئے نہایت ضروری ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی مذکورہ کتاب اور ادارۂ تحقیقات کے دیگر سابقہ مجلات اور مضامین کو بکلیت ضبط کر لیا جائے، نیز ڈاکٹر صاحب اور ان کے حوارین کو مسلمانوں کے مذہبی جذبات مجروح کرنے پر تعزیرات پاکستان کی دفعات ۲۹۵ء، ۲۹۸ کے تحت عبرتناک سزا دی جائے، یہ ایک کم سے کم تعزیر ہے اگر ملک میں اسلامی قانون کا دور دورہ ہوتا تو اسلام میں اسکی سزا انتہائی سخت قسم کی تجویز ہوتی۔ اس کے علاوہ یا تو ادارۂ تحقیقات کو یکسر بند کر دیا جائے یا پھر تشکیل جدید تک ایسے تمام حضرات کو ادارہ سے الگ کر دیا جائے جو نہ صرف یہ کہ ڈاکٹر صاحب کے طرز فکر پہ سوچتے ہیں، بلکہ اب تک ان کی ساری کوشش کا محور "اسلام کی نئی ترجمانی" اور ڈاکٹر صاحب کے خیالات کی تشریح و تائید رہی ہے۔ ان لوگوں کے غیر اسلامی ذہن و فکر کی شہادت ان کے مضامین اور مقالات دے رہے ہیں۔

اس سلسلے میں ماہنامہ فکر و نظر اور اس کے مدیر کا طرزِ عمل نہایت جارحانہ اور مسلم آزار رہا ہے۔ دین کو نئے سانچوں میں ڈھالنا، مذہب کو عالمی بدامنی کا ذریعہ سمجھنا، اسلام کو اشتراکیت سے ہم آہنگ کرنا علماء حق کو راستے سے ہٹا دینا یا انہیں پابجولاں کرنا مدارس اور دینی اداروں کو بزورِ شمشیر تالے لگوا دینا اور ملک کو ترکی اور دیگر لادینی ریاستوں کے مطابق کر دینا وغیرہ اس کے اداریوں اور مدیر کے تدبر کا اب تک محور رہا ہے۔ یہ طرزِ عمل نہ صرف یہ کہ حکومت اور علماء حق کے درمیان بے اعتمادی اور نفرت کی خلیج وسیع سے وسیع تر ہونے کا سبب بن رہا ہے، بلکہ تمام مسلمانوں کی بے چینی اور اضطراب میں بھی اضافہ در اضافہ کا موجب ہے۔ اگر ادارہ سے اس قسم کا دل آزار لٹریچر شائع ہوتا ہے اور ڈاکٹر صاحب کو کسی دوسرے سرکاری منصب یا غیر سرکاری حیثیت میں اپنے ملحدانہ خیالات کی اشاعت کی کھلی چھٹی ہو تو ایک شخص کے استعفیٰ سے وہ اضطراب اور بے چینی ختم نہ ہو سکے گی جس نے خیبر سے چاٹگام تک ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ بنیادی طور پر کرنے کا کام یہ ہے کہ ادارۂ تحقیقات کے عزائم، مقاصد اور طریقِ کار کو صحیح دینی خطوط پر از سرِ نو تشکیل کر کے اسے ملک کے معتمد علیہ متبحر علماء حق کے سپرد کر دیا جائے جو دینی اقدار اور روایات کی ابدیت اور صداقت پر دل و جان سے ایمان رکھتے ہوں اور جنہیں جدید عصری تقاضوں پر بھی مومنانہ بصیرت کے ساتھ گہری نظر بھی ہو ورنہ یہ بات یقینی ہے کہ موجودہ کیفیت برقرار رکھنے کی شکل میں قوم کی دولت اور وقت ضائع کرنے اور مسلمانوں کا ذہنی انتشار اور بد اعتمادی کی فضا میں مبتلا رہنے کے سوا کچھ نہ ہو سکے گا، پاکستان کی اکثریت کو دینی انحطاط کے باوجود اپنی تابندہ روایات کی تاریخی صلابت اور دوام و سچائی پر ایسا پختہ ایمان ہے جسے اسمتھ اور شاخت کے فراہم کردہ اوزار سے نہیں توڑا جا سکتا۔ دین کی اعلاء اور سربلندی اور اسلامی نوامیس کی حفاظت کے لئے مسلمانوں اور علماء حق کا یہ جوش و اضطراب اور یہ سوز و تڑپ کسی سیاسی اور مادی تحرک یا کسی شخص اور فرد سے ذاتی عناد اور تعصب پر ہرگز مبنی نہیں بلکہ مقصود اول و آخر دین اور اس کی طفیل ملک و ملت کی فلاح و بہبود ہے اور اس کے لئے بحمد اللہ ملک میں تن من دھن سب کچھ لٹانے والوں کی کمی نہیں اور عزت و عزیمت کے روشن میناروں سے ملک کا گوشہ گوشہ جگمگا رہا ہے۔

★

کراچی میں ولی عہد اردن شہزادہ حسن اور مس ثروت کی شادی نے ملوک غسان اور شاہان ساسان کے الف لیلوی قصوں کی یاد تازہ کر دی، نشست گاہ کی آرائش کیلئے بیروت تک سے تازہ پھول لائے گئے بے حد و حساب رسومات میں صرف ایک رسم "جوتا چرائی" کی قیمت ۲ ہزار

دینار (۲۰ ہزار پاکستانی) ادا کی گئی ہماری حکومت نے بھی روایتی مہمان نوازی کو برقرار رکھ کر اس تقریب کی شان وشوکت دوبالا کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھائی۔ ہر چند کہ یہ ایک حلیف مسلمان ملک کے شاہی خانوادے کی شاہی شادی تھی، اور اس پر جتنی بھی مسرت ہوتی اس کا حق ادا نہ ہوتا۔ مگر اس کے باوجود دلی احساسات اور تاثرات کو چھپائے نہیں چھپایا جاسکتا کہ دونوں ملکوں کے ترقی پذیر معاشرہ اور غریب عوام پر اس رسم و رواج، شاہانہ اسراف اور فضول خرچیوں پھر اخبارات، فلموں، ٹیلی ویژن اور ریڈیو پر اس کی تشہیر کا کچھ خوشگوار اثر نہیں پڑے گا۔ جو لوگ نانِ شبینہ کے محتاج ہیں وہ بھی شادی بیاہ کے کمر توڑ دینے والے اخراجات اور رسم و رواج میں اپنے حکمرانوں کے ایسے "کارناموں" کو اسوہ بنانا چاہیں گے، اجبکہ خود بھی اونچے ایوانوں سے لایعنی رسومات، جہیز وغیرہ کی لعنت سے احتراز برتنے کی اپیلیں کی جاتی ہیں۔ مسلمانوں کا سب سے بڑا المیہ ان کے حکمرانوں کی یہی دورنگی اور قول و عمل کا تضاد ہے، وہ کفایت شعاری کی تلقین کرتے ہیں، مگر خود دولت کو نہایت بے دردی سے ضائع کرتے ہیں۔ وہ ذخیرہ اندوزی اور اکتنازِ دولت سے منع کرتے ہیں، مگر قوم و ملک کو اپنی جاگیر سمجھتے ہیں۔ وہ لوگوں کو بے حیائی اور فحاشی سے روکتے ہیں مگر خود رقص اور موسیقی کی محفلوں کی زینت بڑھاتے ہیں اور اسے ثقافت کی ترقی اور سرپرستی قرار دیتے ہیں، وہ سٹیج پر اسلام اور اسلامی اقدار کی تلقین کرتے ہیں مگر اپنی زندگی اور عمل سے اس کے پرخچے اڑاتے ہیں الغرض وہ جو کچھ کہتے ہیں اپنی نجی زندگی میں اپنے کہے کا خود مذاق اڑانے لگتے ہیں پھر موجودہ دور کے اخبار، فلم اور ٹیلی ویژن نے انکی نجی زندگی کو بھی نجی نہیں رہنے دیا، بلکہ خلوت کو جلوت بنادیا ہے۔ قول اور عمل کے اس تضاد کو قرآن نے منافقت سے تعبیر کیا ہے اور معاشرہ کی تعمیر صداقت سے تو ہوسکتی ہے مگر منافقت سے ہرگز نہیں۔

پھر اردن کی پوزیشن تو موجودہ نازک اور دردانگیز حالات میں اور بھی نازک تر ہے بیت المقدس یہود کے قبضہ میں ہے۔ انبیاء کی سرزمین کفار کے قدموں اور ان کے شرمناک اعمال اور فواحش سے ناپاک ہورہی ہے۔ خطۂ جنت کو شیطان نے اپنی جاگیر بنالیا ہے۔ ابراہیم و اسحاق، سلیمان و یعقوب (علیہم السلام) کی مسجدیں اذانوں کے لئے ترس رہی ہیں۔ عمر بن الخطابؓ کی مسجد عظمت فاروقی کی دہائی دے رہی ہے۔ خالدؓ اور ابو عبیدہؓ کی روح بے چین ہے، ہمارے مظلوم بھائیوں کے سینے دشمن کی گولیوں سے چھلنی ہورہے ہیں، ایسے حالات میں یہ جشن یہ

شادیانے اور عالمِ اسلام کی یہ خرمستیاں، بے فکری اور فارغ البالی کے یہ شرمناک مظاہرے اور قوت و دولت کا اس فراوانی سے ضیاع ــــ لاحول ولاقوۃ الا باللہ ــــ اس وقت نگاہیں اس صلاح الدین ایوبی کو ترس رہی ہیں جس نے بیت المقدس کی خاطر زندگی کی تمام لذتوں اور ہر عیش و آرام کو خیرباد کہا جسے جہاد سے عشق تھا اور جہاد ہی جس کا اوڑھنا بچھونا تھا، اور تپتے ریگستانوں اور صحراؤں کا بوسیدہ خیمہ جس کا مسکن تھا ــــ اسی مسجد اقصیٰ قبلۂ اوّل کی خاطر سلطان کی کیفیت اس غمزدہ ماں جیسی ہوتی تھی جس نے اپنے اکلوتے بچّہ کا داغ اٹھایا ہو، وہ ایک صف سے دوسری صف تک گھوڑے پر دوڑتے پھرتے اور چیخ چیخ کر پکارتے "یا للاسلام" اسلام کی مدد کرو، آنسوؤں سے لڑی جاری رہتی، سقوط بیت المقدس کے زمانہ میں سلطان پر ایسے دن بھی آئے کہ سارے دن میں ایک دانہ منہ میں نہ رکھا، طبیب کے اصرار پر کچھ دوائی پی لیتے۔ الغرض بقول قاضی ابن شدّاد سلطان کو بیت المقدس کی ایسی فکر تھی اور دل پر ایسا بار تھا کہ پہاڑ اس کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے، ظاہری اور مادی جدوجہد کے ساتھ رات کو سلطان کی کیا کیفیت ہوتی ۔؟ سلطان کے حاضر باش ساتھی قاضی ابن شدّاد ہی سے سنئے سجدہ میں سر رکھ کر گڑگڑاتے اور کہتے: "خدایا مادی اسباب اور دنیاوی سہارے سب ٹوٹ چکے اب تیرے دین کی مدد اور فتح کیلئے صرف یہی سہارا رہ گیا ہے کہ تیرے آستانہ پر سر رکھ دیا جائے اور تیرے سہارے کو مضبوط پکڑ لیا جائے، اب صرف تیرا ہی بھروسہ ہے اور تو ہی میرا حامی و ناصر ہے ــــ" یہ حالت ہوتی، یہاں تک کہ کفر و الحاد کے بادل چھٹ گئے اور بیت المقدس پر اسلام کا ہلالی پرچم لہرا کر چین نصیب ہوا ــــ ــــ اب موازنہ کیجئے ۵۸۳ھ کا اپنے زمانہ ۱۳۸۸ھ سے حالت کہاں سے کہاں پہنچی۔ آہ! ملّتِ مسلمہ اب کہاں سے لائے گی کسی صلاح الدین کو جبکہ مقابلہ عہد ایوبی کے صلیبی اتحادیوں سے زیادہ طاقتور دشمن سے ہے، اگر آج مسلمانوں میں کوئی بھی صلاح الدین جیسا نہیں رہا تو ایمان و یقین سے عاری نعروں اور یہود و نصاریٰ کے طور طریقوں میں ڈوب کر تم بیت المقدس واگذار کرنے کی امید کیسے قائم کر رہے ہو۔ ان جشنوں اور مسرتوں کی محفلیں برپا کرکے نہ تو تمہیں بیت المقدس مل سکتا ہے، نہ کشمیر کی فضائیں اللہ اکبر کے نعروں سے گونج سکتی ہیں۔ اور نہ قبرص کے مسلمانوں کو عزت اور اطمینان کی زندگی مل سکتی ہے۔ بہرحال اس شان و شوکت اور اس طمطراق کی شادی تو اس امر کی غمازی کرتی ہے کہ گویا ہم نے ابھی ابھی کارزار کفر و دین کو سر کر لیا ہے، جیت کا پھریرا ہمارے ہاتھ میں ہے اور ہم جشنِ فتح منا رہے ہیں ــــ واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل ۔

سمیع الحق

ڈاکٹر فضل الرحمٰن کا اسلام

اس کی تحریرات کے آئینہ میں

ڈاکٹر فضل الرحمان کے نظریات اور اسکی تازہ تصنیف "اسلام" (مطبوعہ ۱۹۶۶ء) کا ملک میں جو رد عمل ہوا افسوس کہ بعض لوگوں نے ان ایمانی احساسات اور جذبات کو دیگر اغراض پر محمول کیا اور نہایت ڈھٹائی سے ڈاکٹر فضل الرحمان اور اسکی مذکورہ تصنیف کی صفائی پیش کرنا چاہی اور مسلمانوں کے احتجاج کو کتاب کے اصل مندرجات سے بے خبر ہونے پر محمول کیا۔ ہم ذیل میں مذکورہ تصنیف کے بعض نہایت دل آزار حصے مع ترجمہ بلا تبصرہ پیش کر رہے ہیں جن میں نہایت پیچیدہ اور فلسفیانہ اصطلاحات اور لفظی ہیر پھیر کے ذریعہ کتاب و سنت، وحی اور رسالت کی حقیقت مسخ کرنے، مقام نبوت مجروح کرنے اور قرآن کریم کے اعتماد و یقین میں شک اور تذبذب پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ تمام کتاب اس قسم کے اور کئی "اجتہادات" سے بھری ہوئی ہے۔ یہاں صرف چند ایک پر اکتفاء کیا گیا ہے۔ ——— ادارہ ———

Legislation of Quran is not internal

Whereas the spirit of the Qur'anic legislation exhibits an obvious direction towards the progressive embodiment of the fundamental human values of freedom and responsibility in fresh legislation, nevertheless the actual legislation

قرآنی قوانین ابدی نہیں ہیں

ہر چند کہ قرآنی قوانین کی روح جدید قانون سازی میں آزادی، مسئولیت کی بنیادی انسانی قدروں کی تدریجی تشکیل کی ایک واضح سمت دکھلاتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود قرآن کو اپنے اصل قوانین کی تشکیل و تدوین

of the Qur an had partly to accept the then existing society as a term of reference. (This clearly means that the actual legislation of the Qur'an cannot have been meant to be literally eternal by the Qu'ran itself.) This fact has no reference to the doctrine of the eternity of Qu'ran or to the allied doctrine of the verbal revelation of the Qur'an Very soon, however, the Muslim lawyers and dogmaticians began to confuse the issue and the strictly legal injunctions of the Quran were throught to apply to any society, no matter what its conditions, what its structure and what its inner dynamics.)

کے لئے اس وقت کے معاشرہ کو اپنے موضوع مطالعہ کی حیثیت سے جزوی طور پر قبول کرنا پڑا۔ اس کا مطلب صاف یہ نکلا ہے کہ خود قرآن اپنے اصل قوانین کو ابدی قرار نہیں دیتا۔ ہم نے جو یہ حقیقت بیان کی ہے اسکو ابدیت قرآن کے عقیدہ یا قرآن کے لفظ بہ لفظ وحی ہونے کے عقیدہ سے قطعاً کوئی واسطہ نہیں ہے۔ بہرحال کچھ زیادہ زمانہ گذرنے نہیں پایا کہ مسلمان فقیہوں اور اصولیوں نے اس امر تنقیح طلب میں الجھنیں پیدا کرنا شروع کر دیں اور قرآن کے معروف شرعی احکام کے متعلق یہ سمجھ لیا گیا کہ وہ ہر معاشرہ پر قابل اطلاق (یعنی ابدی ہیں) بلالحاظ اس کے کہ معاشرہ کے خاص کوائف و حالات کیا ہیں، اسکی ہئیت ترکیبی کیا ہے، اور اس کے باطن میں کس قسم کی قوت محرکہ پنہاں ہے۔

قرآن بالکلیہ کلام الٰہی نہیں ہے بلکہ کلام محمد بھی ہے

When, however during the second and the third centurise of Islam, acute differences of opinion controversies partly influenced by Christian doctrines, arose among the Muslims about the nature of Revelation, the emerging Muslim 'orthodoxy', which was at the time in the crucial stage of formulating its precise content, emphasized the externality of the Prophet's Revelation in order to safeguard its 'otherness', objectivity and verbal character. The Quran itself certainly maintained the 'otherness' the 'objectivity' and the verbal character of the Revelation, but had equally certainly rejected its externality vis-a-viz the Prophet. It declares, 'The Trusted Spirit has brought it down upon your heart that you may be a warner' (XXVI, 194), and again, 'Say: He who is an enemy of Gabriel (let him be), for it is he who has brought it down upon your heart, (II, 97). But orthodoxy (indeed, all medieval thought) lacked the

بہرحال جب دوسری اور تیسری صدیوں کے دوران اسلام میں ماہیت وحی کے بارے میں رائے کے شدید اختلافات اور مسیحی عقائد کے جزوی اثر کے تحت لفظی مناقشات پیدا ہو گئے تو تشکیل پذیر مسلم راسخیت نے جو اس وقت اپنے واضح اور صحیح مافیہات کی ترتیب و ترکیب کے نازک مرحلے سے گذر رہی تھی، پیغمبر کی وحی کی خارجیت کی اہمیت کو نمایاں کرنا شروع کر دیا تاکہ اس طرح اس کے "دوسرے پن" اسکی معروضیت اور اسکی لفظی خصوصیت کی حفاظت ہو سکے۔ بلاشبہ خود قرآن نے بھی وحی کے "دوسرے پن" اسکی معروضیت اور اسکی لفظی خصوصیت کو قائم رکھا ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اس نے خارجیت وحی بالمقابل پیغمبر کے نظریہ کی تردید بھی کر دی۔ قرآن کہتا ہے ...... لیکن راسخیت

necessary intellectual toals to combine in its formulation of the dagma the otherness and verbal character of the Revelatian on the one hand, and its intimate connection with the work and the religious personality of the Prophet on the other, i. e. it lacked the intellectual capacity to say both that the Quran is entirely the word of God and, in an ordinary sense, also entirely the word of Muhammad. The Quran obviously holds both, for it is insists that it has come to the 'heart' of the Prophet, how can it be external to Him? This, of course, does not necessorily imply that the Prophet did not perceive also a projected figure, as tradition has it, but it is rgmarkable that the Quran itsels makes no mention of any fitufe in this connection: it is only in connection with certain special experiences (commonly connected with the Prophet's Ascension) that the Quran speaks of the Prophet having seen a figure or a spirit, or some other object 'at the farthest end' or 'on the horizon', although here also, as we pointed out in section I of the last chapter, the experience is described as a spiritual one. (But orthodoxy, through the Hadith or the 'tradition' from the Prophet, partly suitably interpreted and partly coined, and through the scince of theology based largely on the Hadith, mace the Revelation of the Prophet entirely through the ear and external to him and regared the angle or the spirit that comes to the heart' an entirely external agent. The modern Western picture of the Prophetic Revelation rests largely on this orthodox formulation rather than on the Quran, as does, of course, the belief of the common Muslim.)

(فی الاصل تمام کی تمام ازمنۂ وسطیٰ کا فلسفہ) کا دامن ان تعقلی آلات سے تہی تھا، جو ایک طرف وحی کے معنًا و لفظاً صحیح ہونے کے عقیدہ کی تشکیل کے لئے ضروری ہوتے ہیں تو دوسری طرف پیغمبر کے کام اور اسکی مذہبی شخصیت کے ساتھ اس عقیدہ کا گہرا تعلق پیدا کرنے کے لئے ان کی ضرورت داعی ہوتی ہے۔ (دوسرے الفاظ میں قدامت پسند لوگوں میں اس ذہنی استعداد کی کمی تھی جسکی بدولت یہ کہا جا سکتا ہے کہ عام معنی کے اعتبار سے قرآن بالکلیہ کلام الٰہی ہے نیز بالکلیہ کلام محمدی بھی۔ قرآن بظاہر ان دونوں باتوں کا قائل نظر آتا ہے۔ کیونکہ اس کا دعویٰ ہے کہ وہ پیغمبر کے "قلب" پر نازل ہوا ہے تو پھر وہ پیغمبر کے لئے خارجی شے کیوں کر ہو سکتا ہے۔) اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ پیغمبر نے ایک پیکر مستحضر کو نہیں دیکھا تھا جیسا کہ حدیث سے ثابت ہے بلکہ یہ بات قابل لحاظ ہے کہ خود قرآن اس بارہ میں کسی پیکر کا تذکرہ نہیں کرتا۔ یہ تو محض چند مخصوص قسم کے تجربات (جو عام طور سے معراج النبی سے مربوط کر دئے گئے ہیں) ہیں، جن کے سلسلہ میں قرآن کہتا ہے کہ پیغمبر نے ایک پیکر یا روح یا کوئی شے "سدرۃ المنتہیٰ" یا "افق" پر دیکھی تھی۔ اگرچہ یہاں بھی جیسا کہ ہم سابقہ باب میں اشارہ کر چکے ہیں، اس تجربہ کو ایک روحانی تجربہ بیان کیا گیا ہے (لیکن قدامت پسند لوگوں نے حدیث نبوی کے ذریعہ جو کچھ تو مصرحہ ہیں اور کچھ مخفی اور علم الٰہیات کے ذریعہ جو بیشتر حدیث پر مبنی ہے۔ پیغمبر کی وحی کو یوں پیش کیا ہے گویا وہ بہ تمام و کمال کانوں سے سنی گئی تھی اور پیغمبر کے لئے ایک خارجی شے تھی۔ اور فرشتہ روح کو جو دل پر نازل ہوتا ہے ایک بالکلیہ خارجی واسطہ بنا دیا۔ جدید مغرب نے پیغمبر کی وحی کی جو تصویر کھینچی ہے وہ قرآن سے کہیں زیادہ اسی قدامت پسندی کے اصول پر مبنی ہے۔ جیسا کہ عام مسلمانوں کا ایمان ہے۔)

When Muhammad's moral intuitive perception rose to the highest point and became identified with the moral law itself (indeed, in these moments his own conduct at points came under Quranic criticism, as is shown by our account in the second section of the preceding chapter and as is evident from the pages of the Quran), the word was given with the inspiration itself. The Quran is thus pure Divine Word, but, of course, it is equally intimately related to the inmost personality of the Prophet Muhammad whose relation ship to it cannot be mechanically conceived like that of a record. The Divine Word flowed through the Prophet's heart.

کلام الٰہی حضور کے اخلاقی ادراک کے تیز ہو جانے پر آپکے قلب سے صادر ہوتا

جب محمد کا اخلاقی وجدانی ادراک اتنا شدید اور تیز ہو گیا کہ اس کا شعور اخلاقی قانون سے بالکل مطابقت اختیار کر لیا۔ (یہ امر واقعہ ہے کہ ان لمحات میں خود آپ کا طریق عمل کبھی کبھی قرآنی تنقید کی زد میں آگیا ہے جیسا کہ ہماری تفصیل مندرجہ باب سبق نیز قرآنی اوراق سے ظاہر ہے) تو کلام خود الہام کے ساتھ دیا گیا۔ اس طرح قرآن خالص کلام الٰہی ہے۔ لیکن اس میں بھی ذرا شک نہیں ہے کہ اس کا محمد کی انتہائی داخلی شخصیت سے اتنا ہی گہرا تعلق ہے۔ اس تعلق کو غیر شعوری ارادے کے بغیر (گراموفون) ریکارڈ کی طرح ایک میکانکی تعلق نہیں سمجھ سکتے۔ یاد رہے کہ کلام الٰہی نبی کریم کے قلب سے رواں ہوا۔

Connected with the warnings about the judgement and as a historicol support against the persecution of the Prophet and his followers, the Quran also repeatedly recites the stories of earlier Prophets Abraham, Noah, Moses, Jesus, etc., men who had also met with opposition whose message had equally been treated with obduracy on ths part of the majority of people. As time passes these stories become fuller and fuller and the images of the earlier Prophets take on more definite shapes. The question of the 'historicity' of these details, i.e. of the extent of their conformity to earlier, pre-Islamic, stories and legends is in itself intersources' of

محمد کو علم تاریخ نہ ہوتا تو وہ وحی الٰہی کو سمجھنے سے قاصر رہتے

قہر الٰہی کے ڈراوے سے مربوط اور پیغمبر اور ان کے متبعین کی تہذیب کے خلاف ایک تاریخی ثبوت کے طور پر قرآن انبیائے سابقین — ابراہیم، نوح، موسیٰ، عیسیٰ وغیرہم کے قصوں کو بھی بار بار بیان کرتا ہے جنہیں ایسی ہی مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا تھا اور جن کے پیغام کے ساتھ لوگوں کی اکثریت نے ایسا ہی متمردانہ سلوک کیا تھا۔ مرور وقت کے ساتھ یہ قصے زیادہ سے زیادہ بھرپور ہوتے چلے جاتے ہیں اور انبیائے سلف کی خیالی تصویریں واضح تر

the Quranic prophetology very meaningful for assessing the real originality and import of the Prophet's message which must be located in the purpose in which these materials were turned and the service in which they were pressed. On the other hand, the Muslim need not fear and reject the historical aqproach to these materials. The Quran certainly says about these stories that they are revealed truth; but, surely, what is revealed is what they are meant to convey and the import with which they are invested. Indeed, (if Muhammad had not known 'historically' (as distinguished from 'through revelation') the materials of the Prophets' stories, he would himself have been at a complete loss to understand what the Revelation was saying to him.

شکلیں اختیار کرنے لگتی ہیں۔ ان تفصیلات کی "تاریخی سند" کا مسئلہ یعنی اس امر کا ثبوت کہ یہ ازمنۂ سلف اور ماقبل اسلام کے قصص وحکایات سے کس حد تک مطابقت رکھتی ہیں، بجائے خود دلچسپ ہے لیکن اتنا ہی پرپیچ آفات بھی ہے۔ نیز قرآنی رسولیات (علم الرسل) کے مادی ماخذوں کا مسئلہ بھی اتنا بامعنی نہیں ہے کہ اس سے پیغمبر کے پیغام کے مصدر اصلی اور اسکی اہمیت کا پتہ چلایا جا سکے جس کا تعین اس مقصد میں کیا جا سکتا ہے جس میں یہ مواد مبدل کر لیا گیا تھا۔ اور اس غرض وغایت میں کیا جا سکتا ہے جسے پورا کرنے کیلئے اس مواد کو استعمال کیا گیا تھا۔

دوسری طرف اہل اسلام کا یہ حال ہے کہ وہ بلاخوف و خطر اس مواد کے تاریخی استدراک کے مطالبہ کو یکسر رد کر دیا کرتے ہیں۔ بلاشبہ قرآن ان قصوں کے بارے میں یہ کہتا ہے کہ یہ سچائی کے ساتھ وحی کئے گئے ہیں۔ لیکن یقینی بات تو یہ ہے کہ ان قصوں سے جس چیز کا ابلاغ مقصود ہے اور جو اہمیت انہیں حاصل ہے، دراصل وہی سب کچھ ہے جو وحی کئے گئے ہیں یہ ایک حقیقت ہے کہ اگر محمدؐ کو انبیاء کے قصوں کے مواد کا تاریخی علم نہ ہوا ہوتا تو آپ خود یہ سمجھنے سے قطعاً قاصر رہے ہوتے کہ وحی آپ سے کہہ کیا رہی ہے۔

Recorded products of the Hadith Unreliable.

In his Muhammedanische Studien, until now the most fundamental work on the subject, I Goldziher declares that it is hardly possible to sift, with any confidence, from the vast material of the Hadith, a portion that may genuinely be referred either to the Prophet or to the early generation of his Companions and that the Hadith is to be regarded rather as a record of the views and attitudes of early generations of Muslims than of the life and teaching of the Prophet or even of his Companions Goldziher, however, maintained that the phenomenon of the Hadith goes back to the

احادیث کے تمام صحیفے ساقط الاعتبار ہیں

گولڈزیہر اپنی کتاب MUHAMMEDANISCHE STUDIEN جو حال تک حدیث کے موضوع پر ایک بے انتہا قسم کی اساسی تصنیف مانی جاتی تھی، یہ اعلان کرتا ہے کہ حدیث کے وسیع انبار میں سے کسی ایسے جزو کا وثوق و اعتماد کے ساتھ رول لینا ایک امر محال ہے جسے پیغمبر یا آپ کے صحابہؓ سے حق کے ساتھ منسوب کیا جا سکے۔ نیز یہ کہ حدیث کو پیغمبر بلکہ خود آپ کے صحابہؓ تک کی حیات و تعلیمات کے صحیفہ

earliest times of Islam and even conceded the possibility of the existance of 'informal' Hadith records contemporaneous with the Prophet, although he voiced his scepticism about some of the alleged records (sahifa) of that period. But, his argument runs, since the corpus of the Hadith continued to swell in each succeeding generation, and since, in each generation, the material runs parallel to and reflects various and often contradictory doctrines of Muslim theological and legal schools, the final recorded products of the Hadiths, which date from the 3rd/9th century must be regarded as being on the whole unreliable as a source for the Prophet's own teaching and conduct.

کی بجائے مسلمانوں کے اوّلین اسلاف کے طریق و خیالات کا دفتر قرار دیا جانا چاہیئے ۔ تاہم گولڈ زیہر اس بات کا قائل ہے کہ آثار حدیث کے سلسلے اسلام کے ازمنۂ اوّلین تک جا ملتے ہیں ، وہ احادیث کے ایسے غیر رسمی صحائف کے وجود کے امکان کو بھی تسلیم کرتا ہے جو عہد نبوت میں قلمبند کئے گئے تھے اگرچہ اس نے اس عہد کے بعض مبینہ صحیفوں کے خلاف چلاّ چلاّ کر اپنے شک و شبہ کا اظہار کیا ہے ۔ اسکی دلیل یہ ہے کہ چونکہ مجموعۂ احادیث میں پشت در پشت اضافہ ہوتا چلا گیا ہے ، اور چونکہ ہر دور کی احادیث نہ صرف متوازی مضامین ہی سے پر ہیں بلکہ وہ مسلم الٰہیات و فقہ کے مکاتیب کے متعدد اور بیشتر متضاد عقائد کی عکاسی کرتی ہیں ۔ اس لئے پیغمبر کی اپنی تعلیمات اور اسوۂ حیات کے ماخذ کی حیثیت سے احادیث مرقوم کے یہ تمام اتمام یافتہ صحیفے جن کے سلسلے تیسری صدی ہجری سے شروع ہوتے ہیں ، یکسر ساقط الاعتبار قرار دیئے جانے چاہئیں ۔۔۔۔۔۔

پانچ میں سے دو نمازیں پیغمبر کی اختراع ہیں قرآن سے ثابت نہیں

The Quran emphasizes prayer because 'it prevents from evil' and helps man to conquer difficulties especially when combined with 'patience'. The five daily prayers are not all mentioned in the Quran but must be taken to represent the later usage of the Prophet himself, since it would be historically impossible to support the view that the Muslims themselves added two new prayers to the three mentioned in the Quran. In the Quran itself the two morning and the evening prayers are mentioned, and later on at Medina the 'middle' prayer at noon was added. But it appears that during the later part of the Prophet's life the prayer 'from the

قرآن نماز پر زور دیتا ہے کیونکہ " یہ برائیوں سے روکتی ہے ، اور بالخصوص صبر کے تعاون کے ساتھ انسان کو مصائب و مشکلات پر غالب آنے میں مدد دیتی ہے ۔ روزانہ کی پنجگانہ نمازیں قرآن میں ساری کی ساری مذکور نہیں ہیں بلکہ یہ فرض کر لیا جا سکتا ہے کہ یہ زائد نمازیں خود پیغمبر کے معمول مابعد کی نمائندگی کرتی ہیں ، کیونکہ تاریخی اعتبار سے تو اس نظریہ کی تائید قطعی طور پہ غیر ممکن نظر آتی ہے ، کہ قرآن کی مذکورہ تین نمازوں میں خود مسلمانوں نے اپنی طرف سے دو کا اضافہ کر دیا

declendion of the sun unto the thick darkness of the night' (XVII, 78) was split into two and similarly the noon prayer and thus the number five was reached.)

تھا۔ اور جہاں تک قرآن کا تعلق ہے اس میں تو صرف فجر اور مغرب دو نمازیں مذکور ہیں۔ اور بعد میں چل کر مدینہ میں نماز ظہر کا اضافہ کر دیا گیا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر کی زندگی کے متاخر دور میں نماز لدلوک الشمس الی غسق اللیل دو کر دی گئیں اور بشمول نماز ظہر کے ان کی تعداد پانچ تک پہنچا دی گئی۔

محمد مرگی کے مرض میں مبتلا تھے یا نہیں
معراج کا عقیدہ محض ایک افسانہ ہے

حدیث کہتی ہے کہ پیغمبرؐ کو پہلا الہامی تجربہ ہوا تو آپ پر حسب ذیل آیات نازل ہوئی تھیں :

اقرأ ....

حضرت محمدؐ کے ابتدائی وقائع و حالات اس حقیقت کیطرف اشارہ کرتے ہیں کہ یہ تجربہ عالم رویا یا نیم خوابی کی حالت یا اس جیسی کیفیت میں وقوع میں آیا تھا کیونکہ پیغمبرؐ کی حدیث میں آیا ہے کہ اپنا یہ تجربہ بیان کرنے کے بعد آپ نے فرمایا "تب میں بیدار ہو گیا" جوں جوں وقت گزرتا گیا : ور حضرت محمدؐ نے اپنے اذعانات پر مبنی ایک شدید جدوجہد کا آغاز فرمایا تو یہ تجربے بار بار ہونے لگے اور حدیث یہ وضاحت کرتی ہے کہ حضرت محمدؐ کے یہ الہامی تجربے (جب آپ شعور کے عمیق تر طبقات میں مستغرق ہو جایا کرتے) بعض مادی تلازمات کے ساتھ وقوع میں آیا کرتے تھے۔ اس سے بعض جدید مورخوں نے یہ قیاس قائم کر لیا کہ

The earliest accounts of Muhammad point to the fact that this experience had occurred in or was accompanied by a state of vision or quasi-dream, for the Prophet is reported to have stated after narrating the experience. 'Then I woke up'. As time passed and Muhammad launched a fierce struggle based on his convictions, these experiences became more frequent, and tradition makes it clear that these revelatory experiences of Muhammad (when he used to sink into the deeper strata of consciousness) were usually accompanied by certain Physical concomitants. From this, some modern historians have conjectured that he suffered from epileptic fits. On a closer examination, however, the epilepsy theory faces objections which seem to us fatal. To begin with, this condition begins only when Muhammad's Prophetic career starts at about the age of forty, there being no trace of it in his earlier life. Secondly, tradition makes it clear that this condition recurred only with a revelatory experience and never occurred independently. This is, indeed, a strange form of epilepsy which is invariably associated with the deliverance of guiding principles

for such a powerful and creative movement as the Prophet's and never occurs by itself. We are not of course, denying the possibility of some one suffering epilepsy and also being endowed with spiritual experiences, but the point is that at least sometimes the former should be capable of occurring independently of the latter even if the latte. may not occur without the former Lastly, it is incredible that a distinct malady such as epilepsy should not have been identifiable clearly and definitely in a sophisticated society like the Meccan or Medinese.

This story also presupposes a picture of the Prophet that represents him in an otherwise normal state of psycho-physical life during the experience, for epilepsy, after all, occurs in and supervenes on a normal state. Now the view of the Prophet and the Prophetic Revelation, that his level of consciousness was 'normal', was something encouraged and, indeed, explicitly formulated by orthodoxy much later. This was supposed to guarantee the externality of the Angle or the Voice in the interests of safeguarding the 'objectivity' of the Revelation. The attempt may seem to us intellectually immature, but at the time when the dogma was in the making, there were compelling reasons for taking this step, particularly the controversies against the rationalists. A great deal of Hadith ('tradition'; see Chapter III), commonly accepted latter, came into existehce portraying the Prophet talking to the Angls in public and graphically describing the appearance of the latter. Despite the fact that it is contradicted by the Qur'an which says'...... We sent him (the Angle) down upon your heart that you may be a warner' (XXVI, 194, cf. II, 97) this idea of the externality of the Angel and the Revelation has become so ingrained in the general Muslim mind that the real picture is anathema to it.

آپ پر مرگی کے دورے پڑا کرتے تھے۔ تاہم اگر مرگی کے نظریہ کا بنظر امعان جائزہ لیا جائے تو یہ نظریہ ایسے اعتراضات سے دوچار دکھائی دیتا ہے جو کافی اہم اور وزنی معلوم ہوتے ہیں۔ اوّل تو یہ کہ یہ حالت صرف اس وقت سے شروع ہوتی ہے جبکہ تقریباً چالیس سالہ عمر سے حضرت محمدؐ کے پیغمبرانہ کردار کا آغاز ہوتا ہے۔ آپ کی حیات ماقبل نبوت میں اس کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ دوسرے یہ کہ حدیث اس امر کی صراحت کرتی ہے کہ اس حالت کا اعادہ صرف الہامی تجربہ کے ساتھ ساتھ ہوتا رہا ہے اور یہ کبھی آزادانہ طور پر وقوع میں نہیں آئی۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ ایک عجیب وغریب قسم کی مرگی معلوم ہوتی ہے جو پیغمبر کی ——— طاقتور اور تخلیقی تحریک کے رہنما اصولوں کے ابلاغ کے ساتھ ہمیشہ متلازم رہی اور از خود کبھی وقوع میں نہیں آئی۔ ہم واقعتاً اس امکان کا انکار نہیں کر رہے ہیں کہ کوئی شخص جو مرگی کے مرض میں مبتلا ہو وہ روحانی تجربات سے بہرہ اندوز ہو سکتا ہے۔ لیکن غور طلب بات تو یہ ہے کہ اول الذکر میں ہمیشہ نہیں تو کم سے کم کبھی کبھار تو مابعد الذکر کے بغیر بھی وقوع پذیر ہونے کی استعداد ہونی چاہیئے خواہ مابعد الذکر اول الذکر کے بغیر وقوع میں نہ آتی ہو۔ آخری اعتراض یہ کہ یہ بات قرین قیاس ہو ہی نہیں سکتی کہ مکہ یا مدینہ جیسی سوفسطائی سوسائٹی مرگی جیسے مخصوص اور متمیز مرض کو واضح طور پر شناخت کرنے سے قاصر رہی ہو۔

یہ قصہ پیغمبر کی اس تصویر پر بھی دلالت کرتا

The same is the case with the rest of the religies experiences of the Prophet. The Qur'an refers to an important transforming experaience or perhaps a series of such experiences of Muhammad in several Suras of the Qur'an (XVII, 1; LIII, 5-18; LXXXI, 23). In all these places, the Quran alludes to the fact that the Prophet saw something 'at the fathest 'or' on the borizon' and this shows that the experience contained an importatelement of the 'expansion' of the self. In LIII, 11-12, the Quran says: The heart has not falsified that it has seen; shall you doubt what it has witnessed?' But the spiritual experience of the Prophet were later woven by tradition. especially when an 'orthodoxy' began to take shape, into the doctrine of a single, physical, locomotive experience of the 'Ascension' of Muhammad to Heaven, and still later were supplied all the graphic details about the animal which was ridden by the Prophet durieg his ascension, about his sojourn in each of the seven heavens, and his parleys with the Prophets of bygone ages from Adam up to Jesus. We may first concede the fact, which is rarely realized by the opponents of 'orthodoxy', that a religion cannot live on purely 'spiritualized' dogmas and that reification is necessary even if only to serve the purpose of a 'vessel' for the spirit. (We may further insist that it is really impossible to hold that something should occur of a purely spiritual nature without a physical concomitant, and we might even assert that a single event may be called spiritual or physical according to its setting or context, yet in either case the doctrine of a locomotive miraj or Ascension' developed by the orthodox (chiefly on the pattern of the Ascension of Jesus) and backed by Hadith is no more than a historical fiction whose materials come from various sources.)

ہے جس میں آپ اپنے تجربہ کے دوران زندگی کی ایک بالکلیہ مختلف نفس جسمانی طبعی حالت میں نظر آتے ہیں کیونکہ مرگی کے دورے تو آپ پر بہرحال پڑتے ہی ہیں لیکن ایک طبعی حالت کے دوران اب رہ گیا پیغمبر اور پیغمبرانہ وحی کا نظریہ یعنی یہ کہ آپ کا معیارِ شعور "طبعی" تھا سو وہ ایک ایسی چیز ہے جسے دراصل علمائے راسخ نے بہت بعد کے زمانہ میں ترکیب دے لیا تھا۔ اس نظریہ کے بارے میں یہ خیال کیا جاتا تھا کہ معروضیت وحی کے استحفاظ کی خاطر اس سے فرشتہ یا آواز کی خارجیت کو قرار واقعی ضمانت مل جاتی ہے۔ ان لوگوں کی یہ سعی ہمیں ذہنی اعتبار سے بظاہر ناقص و ناتمام نظر آتی ہے۔ لیکن جس زمانہ میں یہ عقیدہ تشکیل کے مراحل سے گذر رہا تھا تو اس وقت اس قسم کے اقدام کیلئے ناگزیر وجوہ (بالخصوص عقلیت پسندوں کے خلاف مناظرے) موجود تھے

کئی احادیث جنہیں دور میں چل کر قبولیت عام کی سند ملی ہے؛ ایسی وجود میں آئیں جن میں پیغمبر کو فرشتہ کے ساتھ مجمع عام میں ہم کلام دکھلایا گیا ہے اور فرشتہ کی شکل و شباہت کو بڑی شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اس حقیقت کے باوجود کہ قرآن اسکی ان لفظوں میں تردید کرتا ہے: کہ "ہم نے اس (فرشتہ) کو تمہارے دل پر نازل کیا تاکہ تم ڈرانے والے بنو۔" فرشتہ اور وحی کی خارجیت کا یہ تصور عام مسلمانوں کے ذہنوں میں

کچھ اس طرح رچ بس گیا ہے کہ اس کے سامنے واقعہ کی سبھی تصویر مردود ٹھہرتی ہے۔

یہی حال پیغمبر کے مابقی مذہبی تجربات کا ہے۔ قرآن حضرت محمدؐ کے ایک یا چند اہم متقلب تجربات کا متعدد موروں میں حوالہ دیتا ہے ( )

ان تمام مقامات پر قرآن اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ پیغمبر نے "سدرۃ المنتہیٰ" یا "افق" پر کوئی چیز دیکھی اور اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس تجربہ میں توسیع "ذات" کا ایک اہم عنصر شامل تھا۔ قرآن کہتا ہے کہ دل نے جو کچھ دیکھا اسے جھٹلایا نہیں۔ دل نے جو کچھ دیکھا کیا تم کو اس میں کچھ شک ہے"

لیکن آگے چلکر بالخصوص جبکہ ایک راسخیت تشکیل پذیر ہونے لگی، حدیثوں نے پیغمبر کے تجربات کو حضرت محمدؐ کی معراج سوئے عرش کے جسمانی حرکت پذیر تجربہ کے واحد عقیدہ میں تبدیل کر دیا اور اس سے بھی بعد کے زمانہ میں ان تجربات کے لئے ان جانور کے بارہ میں جس پر پیغمبر نے معراج کے دوران سواری کی تھی، اور ہفت افلاک میں پیغمبر کی ہر فلک کی سیر کے بارے میں اور آدمؑ سے لیکر عیسیٰؑ تک کے انبیائے سابق کے ساتھ آپ کی گفت و شنید کے بارہ میں مشروح و مصرحہ تفصیلات فراہم کی گئیں پہلے ہم اس حقیقت کو مان لیں جس کو راسخیت کے مخالفین شاذ ہی سمجھ پاتے ہیں کہ کوئی مذہب صرف خالص روحانی عقیدوں پر قائم و دائم نہیں رہ سکتا۔ اس کے لئے تجسیم ضرور ہے خواہ اس سے صرف روح ہی کے لئے ایک "پیکر" کی غایت پوری ہوتی ہو۔

(مزید برآں ہم یہ بھی وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ مادی تلازم کے بغیر کسی خالص روحانی جیسی چیز کے وقوع کا قائل ہونا تو حقیقت میں ایک قطعی ناممکن سی بات ہے اور یہ بھی دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ صرف ایک ہی واقعہ کو اس کے ماحول ترتیب کے اعتبار سے روحانی یا مادی قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن ہر دو صورتوں میں ایک حرکت پذیر معراج کا عقیدہ جسے قدامت پسند لوگوں نے (بیشتر رفع مسیحؑ کے نمونہ پر) فروغ دیا ہے اور جسے حدیث کی پشت پناہی حاصل ہے ایک تاریخی افسانہ کے سوا کچھ نہیں جس کا مواد مختلف ماخذوں سے حاصل کیا گیا ہے۔)

★

موتیاروک

● موتیاروک ـــ موتیابند کا بلا اپریشن علاج ہے
● موتیاروک ـــ دھند، جالا، پھولا، ککروں کیلئے بھی بے حد مفید ہے۔
● موتیاروک ـــ بینائی کو تیز کرتا ہے اور چشمہ کی ضرورت نہیں رکھتا۔
● موتیاروک ـــ آنکھ کے ہر مرض کیلئے مفید ہے۔

بیت الحکمت
ـــ لوہاری منڈی لاہور ـــ

از مولانا ابوالحسن علی ندوی

عالمِ اسلام میں

تجدّد اور مغربیت کی تحریک

ترکی کو مغرب بنانے کی کوشش اور اس کے اسباب

مغربی تہذیب نے جس پیچیدہ صورت حال سے عالم اسلام کو دوچار کیا اس سے نمٹنے کیلئے ایک موقف شکست خوردگی، مکمل سپردگی اور ایک عقیدتمند اور سرگرم مقلّد اور ایک ایسے ہونہار و سعادتمند شاگرد کا ہے جو ابھی سن بلوغ کو نہیں پہنچا اور وہ یہ ہے کہ عالم اسلام کا کوئی حصہ اس مادی مشینی اور اپنا مخصوص مزاج و ذہن رکھنے والی تہذیب کو جوں کا توں قبول کرے، اور اس کے سارے بنیادی عقائد، فکری رجحانات، مادی افکار و خیالات اور سیاسی و اقتصادی نظام پر ایمان لے آئے (جو عالمِ اسلام کے ماحول سے بہت دور نہایت مختلف حالات میں پیدا ہوئے اور ان ہی حالات میں ان کی تشکیل اور پرورش ہوئی) پھر اپنے ملک میں اسکی مکمل نقل کرنا چاہے۔ اور اس کے لئے ہر قسم کی قربانی کرنے اور اس کے لئے بڑی سے بڑی قیمت ادا کرنے پر آمادہ ہو۔

اس طرز فکر اور طریقۂ کار کا سب سے پہلے ترکی میں تجربہ کیا گیا، ترکی میں یہ رجحان بہت سے طبعی عوامل اور ایک طویل تاریخ کا نتیجہ تھا۔

ترکی نے ایک طویل عرصہ تک کسی تیاری اور دشمن کے علمی و صنعتی ہتھیاروں سے مسلح ہوئے بغیر یورپ کا مقابلہ کیا، اس نے یورپ سے مفید علوم، ضروری صنعتوں، فوجی تنظیم کے طریقوں کو اخذ کرنے اور ملک کو جدید طریقہ پر منظم کرنے کے ضروری کام میں کوتاہی اور تغافل سے کام لیا، علماء اور دینی رہنماؤں نے ملک و قوم کی علمی و فکری رہنمائی کے سلسلہ میں اس ذہانت، د

جرأت اور محنت کا ثبوت نہیں دیا جس کی ان کے منصب کے لحاظ سے ان سے توقع تھی اور وہ ان رجحانات کی نگرانی نہ کر سکے جو اس ملک میں تیزی سے داخل ہو رہے تھے جن میں سے بعض فطری اور حق بجانب تھے، وہ اچھے برے اور مفید وغیر مفید تقاضوں میں تمیز نہ کر سکے اور علم و فکر کی اسی سرحد پر کھڑے رہ گئے جس سرحد سے علم کا قافلہ اٹھارویں صدی میں گزرا تھا۔[1] اور ان سب چیزوں سے بڑھ کر یہ کہ ترکی کے آخری سلاطین نے مذہب اور خلافت کو اپنے مخصوص مصالح اور ذاتی مفاد کے لئے استعمال کیا، ملک کی پسماندگی فوجی انحطاط، مسلسل شکستوں اور ذلت انگیز ناکامیوں میں ان سلاطین کا بھی کبھی دخل ہوتا تھا، بعض اوقات ان سلاطین اور ان کے وزراء اور ارکان سلطنت نے دشمن سے بھی ساز باز اور قوم فروشی سے بھی احتراز نہیں کیا، یہ واقعات اگرچہ انفرادی تھے لیکن چھپے ڈھکے نہیں تھے اور نوجوان طبقہ کی برافروختگی کا اپنے اندر خاصا سامان رکھتے تھے۔

دشوار اور نازک مرحلہ انیسویں صدی کے آخر میں ترکی کو جس صورت حال کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا وہ فطری اور قدرتی ہونے کے باوجود ایک اسلامی ملک کے لئے اپنی نوعیت کا پہلا تجربہ تھا، اسلامی معاشرہ کو اس سے پہلے دو طرح کے تجربوں سے گزرنا پڑا تھا۔ پہلا تجربہ وہ تھا جو پہلی اور دوسری صدی کے اسلامی معاشرہ کو پیش آیا تھا، اس کی نوعیت یہ تھی کہ اسلامی معاشرہ طاقتور، تازہ دم اور زندگی اور ترقی کی صلاحیتوں سے بھرپور تھا، اس کی حیثیت فاتح اور غالب طاقت کی تھی، اس کے بالمقابل دنیا کی دو قدیم و عظیم تہذیبیں تھیں، ایک مغرب کی رومی و یونانی تہذیب، دوسری مشرق کی ایرانی تہذیب — دونوں تہذیبیں قدیم دنیا کے علوم و فنون، ثقافت و ادب، فلسفیانہ نظاموں کے ذخیرے اور تمدن و معاشرت کے ترقی یافتہ طریقوں سے مالا مال تھیں، اسلامی معاشرہ نے جو ہر طرح کے احساس کمتری سے محفوظ اور خود شناسی اور خود اعتمادی کی دولت سے بھرپور تھا بغیر کسی ذہنی غلامی اور مرعوبیت کے اپنی ضرورت اور اپنے خیالات کے مطابق ان ذخیروں سے استفادہ کیا، جس چیز کو مناسب سمجھا اس کو بجنسہ اخذ کر لیا اور جس چیز کو نامناسب سمجھا اس کو پہلے اپنے سانچے میں ڈھالا، پھر اسکو اپنی صحیح جگہ فٹ کر لیا، آزاد اور غالب ہونے کی بناء پر یہ استفادہ اور اقتباس اس معاشرہ

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مضمون نگار کی کتاب "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر"

کی روح اور اس کے اخلاقی رجحان پر اثر انداز نہیں ہو سکا۔

دوسرا تجربہ وہ تھا جو اس اسلامی معاشرہ کو ساتویں صدی میں اس وقت پیش آیا جب تاتاریوں نے عالم اسلام کے مرکزی حصہ پر قبضہ کر لیا، اور مسلمان سیاسی طور پر ان کے مفتوح اور زیر نگیں ہو گئے، اس وقت اسلامی معاشرہ کو جس فاتح سے سابقہ پڑا، وہ تہذیب و تمدن، علم و فن، قانون و دستور میں بالکل فرومایہ اور تہی دست تھا۔ اس کے پاس نہ کوئی تہذیب تھی، نہ زندگی کا کوئی فلسفہ، معاشرت و اجتماع اور ذہنی نشو و نما کے اعتبار سے وہ اس ابتدائی حالت میں تھا جو صحرائی اور جنگجو اقوام کی ہوا کرتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مفتوح اسلامی معاشرہ کے سامنے فاتح کی تہذیب، معاشرت، فلسفہ حیات اور افکار و اقدار سے متاثر و مستفید ہونے کا کوئی حقیقی سوال نہیں تھا۔ اس کے برخلاف فاتح قوم روز بروز اپنی مفتوح اقوام سے متاثر ہوتی چلی جارہی تھی، وہ بتدریج اپنی مفتوح اقوام کی تہذیب، معاشرت، علوم و فنون، اس کے ترقی یافتہ طریقۂ زندگی اور اس کے اعلیٰ دینی عقائد اور خیالات سے متاثر ہوتی چلی گئی، بالآخر اس نے اپنی مفتوح اقوام کا دین اور ان کی تہذیب پورے طور پر قبول کر لی اور ان کے سانچہ میں ڈھل کر حرم کی پاسبان اور اسلام کی پرجوش علمبردار اور محافظ بن گئی۔

لیکن عثمانی ترکوں کو انیسویں صدی کے وسط میں جس صورت حال سے سابقہ پڑا وہ ان دونوں سابقہ صورتوں سے مختلف تھی، وہ اگرچہ آزاد اور ایک بڑی سلطنت کے مالک تھے، لیکن مرور زمانہ کے ساتھ خود شناسی اور خود اعتمادی کا جوہر بہت کچھ کھو چکے تھے، ان میں نہ تو قرون اولیٰ کا جوش تھا، نہ ایمان و یقین کی وہ طاقت، اس کے بالمقابل مغربی تہذیب، نئی زندگی، نئی قوت سے معمور اور نئے جوش اور نئی امنگوں سے مخمور تھی، وہ اپنے ساتھ ایک ایسا صنعتی، علمی و فکری انقلاب لائی تھی جس کے حدود روز بروز وسیع سے وسیع تر ہوتے چلے جارہے تھے اور جس سے صرف نظر کرنا ان ترکوں کے لئے ممکن نہ تھا جن کا مرکز سلطنت یورپ کے قلب میں تھا، اس تجربہ کو کامیابی سے گزارنے کے لئے اور اس سے قصمندانہ طریقہ سے نکلنے کے لئے انکو رہنمائی نہ گذشتہ اسلامی تاریخ سے مل سکتی تھی جس میں اس قسم کی کوئی نظیر نہیں پائی جاتی، نہ موجودہ عالم اسلام سے جس کے لئے یہ پہلا تجربہ تھا اور جو خود ترکی کے میدان میں پیش آرہا تھا، اور پورے عالم اسلام کی ترکی ہی پر نظر جمی ہوئی تھی کہ وہ اس سلسلہ میں کون سا موقف اختیار کرتا ہے، اور ممالک اسلامیہ کو کیا رہنمائی دیتا ہے۔؟

اس نازک اور دشوار تجربہ سے عہدہ برآ ہونے کے لئے اعلیٰ درجہ کی ذہانت، اسلام اور مغربی تہذیب سے گہری واقفیت اور بہت بڑی جرأت کی ضرورت تھی، یہ درحقیقت ایک مجتہدانہ کام تھا جس کو ترکی کو چار و ناچار انجام دینا تھا، جس میں سارا عالم اسلام اسکی تقلید اور پیروی کے لئے تیار تھا، اسی کام کی تکمیل پر عالم اسلام کے تہذیبی و فکری اور کسی حد تک دینی و سیاسی مستقبل کا بھی انحصار تھا، اس ضرورت کو نہ تو ٹالا جا سکتا تھا، نہ سرسری طور پر اس سے گزرا جا سکتا تھا، نہ اس کے لئے کوئی مہلت لی جا سکتی تھی، یہ ایک ناگزیر فریضہ تھا، جس کو جلد سے جلد ادا ہونا چاہیئے تھا۔ اور جس کو ہر مسئلہ پر مقدم رکھنا چاہیئے تھا۔

قدیم و جدید گروہ اس فریضہ کی تکمیل کے لئے ترکی کے دو گروہوں پر نظر پڑتی تھی، ایک قدیم علماء کا گروہ جو افسوس ہے کہ جدید تقاضوں اور جدید تبدیلیوں سے بہت حد تک ناواقف تھا اور اس خطرہ کی سنگینی سے بہت حد تک بے خبر تھا جو یورپ کی بڑھتی ہوئی طاقت نے ترکی کے لئے پیدا کر دیا تھا۔ اس گروہ نے سلطان سلیم ثالث (۱۷۸۹ء، ۱۸۰۷ء) اور اس کے جانشین سلطان محمود (۱۸۰۸ء، ۱۸۳۹ء) کی نئی فوجی تنظیمات اور جدید اصلاحات کی بھی مخالفت کی تھی جو انہوں نے ترکی کو عسکری و علمی لحاظ سے یورپ کی ابھرتی ہوئی طاقتوں کے دوش بدوش لے چلنے کے لئے نافذ کی تھیں۔

جہاں تک نئی نسل کا تعلق ہے (جو پیرس، برلن اور لندن یا خود اپنے ملک کی بعض جدید مغربی طرز کی تعلیم گاہوں میں زیر تعلیم تھی) اس کا نشوونما، دین کی بے وقعتی، دینی مستقبل سے مایوسی، اہل دین کی تحقیر، مغربی تمدن کی غیر محدود تقدیس و عقیدت، مادی اقدار اور مغربی رجحانات و خیالات کے سامنے مکمل سپر انداختگی پر ہوا تھا، اس نسل میں اس دور رس اور بالغ نظر و فکر کا فقدان تھا جو مغربی فلسفۂ حیات کی تنقید پر قادر ہو اور یہ محسوس کر سکتا ہو کہ اس کے کمزور حصے کیا ہیں، کس جگہ افراط و تفریط سے کام لیا گیا ہے، کیا چیزیں ترکی کے لئے (جو عالم اسلام کا قائد و رہنما تھا) مفید ہیں اور ان سے استفادہ و اقتباس جائز بلکہ ضروری ہے، اور کیا چیزیں اس کے مزاج اور تاریخ، دنیا میں اس کے مقام اور کردار سے مطابقت نہیں رکھتیں اور اس کے بلند قامت پر راست نہیں آتیں۔؟

اس نسل کی قیادت زیادہ تر ان معلمین یا فوجی تعلیم حاصل کرنے والوں پر مشتمل تھی جن کی ثقافت نہ وسیع تھی، نہ گہری، نہ آزاد، یا وہ لوگ تھے جنہیں ان کی زندگی کے کچھ خاص تجربات، علماء اور قدامت پرستوں کی سرد مہری، بے توجہی اور جمود و تنگ نظری، قدیم نسل اور اس کے رہنماؤں میں

نفاق اور قول و عمل کے تضاد کا تجربہ کرتے اور ملک میں انحطاط و پسماندگی کے عام مناظر کے مشاہدہ نے ہر قدیم چیز اور ہر قسم کے موجودہ نظام سے متنفر و باغی بنا دیا تھا اور ترکی جلد سے جلد "مغرب" بنا دینے کے کام پر آمادہ و کمربستہ کر دیا تھا۔ [۱]

ضیاء گوک الپ اور ان کا نظریہ | فکری و ذہنی تعمیر کے میدان میں ترکی کو ضیاء گوک الپ [۲] جیسے لوگ ملے جنہوں نے بلند آہنگی اور جوش کے ساتھ ترکی کو اپنے ماضی قریب سے علیحدگی

---

[۱] مشہور ترک فاضلہ خالدہ ادیب خانم اپنی کتاب "ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش" میں انجمن اتحاد و ترقی کے ارکان پر تبصرہ کرتی ہوئی لکھتی ہیں :-

"اتحاد و ترقی کے نوجوان ترک چھوٹے درجہ کے سرکاری ملازم یا فوجی افسر تھے، ابتداء میں ان میں ایک بھی شخص نہ تھا جو اعلیٰ علمی قابلیت رکھتا ہو اور تخیل و تنقید سے کام لے کر پرانے اور نئے زمانے کے فرق کو سمجھ سکے، مگر یہ لوگ جمہور سے زیادہ قریب اور خالص دیسی پیداوار تھے، ان میں زیادہ تعداد مقدونیہ کے باشندوں کی تھی جو قومیت پسندی اور بے رحمی میں مشہور ہیں اور اپنے مقصد کے حاصل کرنے کیلئے سب کچھ کر گزرتے ہیں، اس لئے گو وہ اعلیٰ مقصد رکھتے تھے مگر ہر طرح کے وسائل بے تکلف اختیار کر لیتے تھے۔۔۔۔"

(صفحہ ۹۹ ۔۔۔ ترجمہ شائع کردہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی)

[۲] ضیاء گوک الپ کی ولادت دیار بکر میں ۱۸۷۵ء یا ۱۸۷۶ء میں ہوئی، اس کا خاندان حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہا ہے۔ ملٹری سکنڈری اسکول کے بعد دیار بکر کے سکنڈری سکول میں داخل ہوا، اس کو ادب و ریاضی کا خاص ذوق تھا، تاریخ سے بھی اچھی واقفیت تھی، اسکول ہی میں ضیاء نے فرنچ اور مشرقیات کی تعلیم شروع کی اپنے فاضل چچا کی مدد سے مفکرین اسلام، غزالی، رومی، ابن عربی، ابن رشد، ابن سینا اور فارابی وغیرہ کا مطالعہ کیا، وہ امام غزالی کے المنقذ من الضلال سے زیادہ متاثر ہوا۔ اس لئے کہ وہ بھی ذہنی کشمکش سے دوچار تھا، یہ وہ زمانہ تھا کہ انقلاب فرانس کے افکار و خیالات ترکی کی جدید نسل کے خون میں جوش پیدا کر رہے تھے، ضیاء کے اسکول کا ہیڈ ماسٹر آزاد خیالی اور حریت پسندی کے خیالات رکھتا تھا، اس وقت دیار بکر میں ترکی رہنماؤں اور حریت پسندوں کا ایک جلاوطن گروہ موجود تھا جس سے ضیاء نے روابط پیدا کئے، ضیاء نے اسی سلسلہ میں نامق کمال، ضیاء پاشا، احمد مدحت آفندی وغیرہ کے مضامین پڑھے، عبداللہ کی آمد کے بعد اس کا خفیہ تحریک سے ارتباط بڑھ گیا، یہ کرد ڈاکٹر ملحد تھا اور ہیکل (HAECKEL) بشنر (BUCHNER) سپنسر

اور خالص قومی اور مادی بنیادوں پر تعمیر و تشکیل جدید کی دعوت دی، ضیاء گوک الپ نے مغربی تہذیب کو اختیار کرنے کی وجہ یہ بتائی کہ وہ دراصل اس قدیم تمدن کے امتداد و تسلسل کی ایک شکل ہے جس

(SPENCER) اور لی بون (LE BON) سے بہت متاثر تھا، اسی زمانہ میں ایک یونانی استاد کے اثر سے اس کے اندر عقیدے اور عقلیت کی کشمکش پیدا ہوئی، اس نے اسلامی فلسفہ اور تصوف سے تشفی حاصل کرنا چاہی مگر بقول اس کے اس میں اسکو کامیابی نہیں ہوئی اور وہ ارتیابیت (AGNOSTICISM) میں گرفتار ہو گیا۔
۱۸۹۶ء میں وہ قسطنطنیہ گیا اس کو صرف ویٹرنری کالج (VETERINARY COLLEGE) میں وظیفہ مل سکا، لیکن وہ تعلیم سے زیادہ سیاست سے دلچسپی لیتا تھا اسی بنا پر انجمن اتحاد و ترقی کا رکن چن لیا گیا جو فری میسن کی طرح خفیہ کام کرتی تھی، اس کی بعض باغیانہ تحریروں کی بنا پر کالج سے اس کا اخراج ہوا اور وہ گرفتار کر لیا گیا، جیل سے چھوٹنے کے بعد اسکو دیار بکر میں نظربند کر دیا گیا۔ اس عرصہ میں اس نے گہرا مطالعہ کیا، اسکی توجہ اور دلچسپی کے خاص مضامین مغربی بالخصوص فرانسیسی فلسفہ، سائیکالوجی اور سوشیالوجی تھے، وہ جلد دیار بکر کی حریت پسند عنصر کی مرکزی شخصیت بن گیا۔ ۱۹۰۷ء میں اس عنصر نے ضیاء کی قیادت میں جابرانہ نظام اور انتظامی مشینری کے خلاف بغاوت کر دی، ۱۹۰۹ء میں سلطان عبدالحمید خان کی معزولی کے بعد ضیاء اور اس کے رفقاء آزادی سے کام کرنے کے قابل ہوئے۔ اس نے دو اخبارات "پیام" اور (DECLE) جاری کئے۔
سالونیکا میں مستقل قیام اختیار کرنے کے بعد ضیاء ترکی کا ایک قوم پرست لیڈر بن گیا، یہاں ترکی کے اس مغربی سرحدی علاقہ میں رہ کر اس کو روشن خیال ترک اور مغربی فضلاء سے زیادہ قریب ہونے کا موقع ملا۔ اور اس کے اندر ترکی قومیت کی بنیاد پر اتحاد و تنظیم کے فکر نے نشو و نما حاصل کی جس میں اسلام بنیادی عامل (FACTOR) کی حیثیت نہیں رکھتا ۱۹۱۲ء میں جنگ بلقان کے نتیجہ میں ترکی کے زیر حکومت متعدد اسلامی ممالک (۱۹۱۲ء میں البانیہ اور ۱۹۱۶ء میں حجاز) نکل گئے جس سے تحریک قومیت و وطنیت قدرۃً زیادہ معقول اور حقیقت پسندی پر مبنی نظر آنے لگی، ترکی کی نئی نسل پر گوک الپ کا ذہنی اثر اس وقت بہت مستحکم اور وسیع ہو گیا، جب وہ ۱۹۱۵ء میں (محض اپنی ذاتی قابلیت اور مضامین کی بنا پر بغیر کسی علمی سند و فراغت کے) استنبول یونیورسٹی میں علوم عمرانیہ کا استاذ اول مقرر ہوا۔ ۱۹۱۸ء میں دوسرے محب وطن ترکوں کیطرح اس کو بھی استنبول چھوڑنا پڑا، ۱۹۲۱ء میں جب مصطفیٰ کمال نے یونانیوں پر فتح حاصل کی تو وہ رہا ہوا، ۱۹۲۲ء میں وہ ہیئت تالیف و ترجمہ کا صدر نامزد ہوا۔ وہ کمال کا پرجوش حامی تھا، اور انتخاب میں اس نے اس کے لئے بڑا کام کیا تھا، اگرچہ ان سے اس کے ذاتی تعلقات کبھی گہرے نہیں ہوئے۔ ۱۹۲۲ء میں جب پارلیمنٹ منتخب

کے نشوونما اور حفاظت میں (بقول اس کے) ترکوں کا خاص حصہ رہا ہے، وہ اپنے ایک مضمون میں لکھتا ہے:۔

"مغربی تہذیب درحقیقت بحرِ روم کی تہذیب کا امتداد (CONTINUATION) ہے، اس تہذیب (جسکو ہم بحیرہ روم کے منطقہ کی تہذیب کہتے ہیں) کے بانی سماری (SUMERIANS) سیتھی (SCYTHIANS) فینیقی (PHOENICIANS) رعاۃ (HYKSOS) ترکی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ تاریخ میں قدیم زمانوں سے پہلے ایک طورانی دور کا وجود ملتا ہے، اس لئے کہ وسطِ ایشیا کے قدیم باشندے ہمارے اجداد تھے۔ اس کے عرصہ بعد مسلمان ترکوں نے اس تہذیب کو ترقی دی اور اس کو یورپ تک پہنچایا، پھر مغربی و مشرقی سلطنت روما کے خاتمہ کے بعد ترکوں نے یورپ کی تاریخ میں انقلاب پیدا کیا، اور اسی بنیاد پر ہم مغربی تہذیب کا جزو ہیں اور ہمارا اس میں حصہ ہے"[1]

مغربی تہذیب کا اختیار کرنا کیوں ضروری ہے، اس انتخاب و اختیار کے نتیجہ میں کیا انقلاب رونما ہوگا اور ترکی کے جسدِ مردہ میں کس طرح نئی قوت اور نئی روح پیدا ہوجائے گی؟ اس کا جواب دیتے ہوئے وہ لکھتا ہے:۔

"جب کوئی قوم اپنے نشوونما ارتقاء کا ایک بڑا فاصلہ طے کرچکی ہے تو اپنی تہذیب کا تبدیل کرنا بھی ضروری سمجھتی ہے۔ جب ترک خانہ بدوش قبائل کی حیثیت سے وسط ایشیا میں تھے تو اس وقت وہ مشرقِ بعید کی تہذیب کے اثر میں تھے،

ہوئی اس میں وہ دیار بکر کا نمائندہ تھا، ۱۹۲۴ء میں وہ علیل ہوا، کمال اتاترک نے یورپ میں اس کے علاج کے مصارف کی ساری ذمہ داری لینے کا وعدہ کیا۔ گوک الپ نے صرف اس خواہش کا اظہار کیا اس کے خاندان کا خیال رکھا جائے اور اس کی اس تصنیف کی اشاعت کا انتظام کیا جائے۔ جو ترکی تہذیب کے موضوع پر ہے۔ ۲۵ر اکتوبر ۱۹۲۴ء کو ۴۸ یا ۴۹ سال کی عمر میں انتقال کیا اور مقبرہ سلطان محمود میں دفن ہوا۔

(ماخوذ از کتاب FOUNDATIONS OF TURKISH NATIONALISM از HEYD. U)

[1] GOKALP ZIYA: TURKISH NATIONALISM AND WESTERN CIVILIZATION. P-267 (باختصار)

9888

جب سلطنت (عثمانی) کے عہد میں آئے تو بیز نطینی دائرہ اثر میں داخل رہے اور جبکہ وہ عوامی دور حکومت کی طرف منتقل ہو رہے ہیں، انہوں نے مغربی تہذیب کو قبول کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا ہے۔[1]"

وہ ثابت کرتا ہے کہ اس انتخاب سے ترکی کی اسلام سے علیحدگی ضروری نہیں ہے۔

"معاشرے، مذاہب و ثقافت کے اختلاف کے باوجود ایک مشترک تہذیب اختیار کر سکتے ہیں، جاپانی اور یہودی مذہب و عقیدہ میں اختلاف کے باوجود اہل مغرب کے ساتھ ان کی تہذیب میں برابر کے شریک ہیں۔[2]"

وہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ مذہب اور تہذیب دو مختلف چیزیں ہیں، "اسلامی تہذیب" یا "مسیحی تہذیب" ایک قسم کا مغالطہ ہے، مذہب عقیدے اور بعض عبادات و مراسم تک محدود ہے جس کا علوم و فنون سے کوئی رشتہ نہیں۔

"کوئی ادارہ ایسا نہیں ہو سکتا جو ان گروہوں کے درمیان مشترک ہو جو مختلف مذاہب سے تعلق رکھتے ہیں، جب واقعہ یہ ہے کہ مذہب صرف ان مقدس اداروں، عقائد اور مراسم کے مجموعہ کا نام ہے تو وہ ادارے جو مذہبی تقدس نہیں رکھتے (مثلاً سائنسی افکار، صنعتی آلات و اوزار، جمالیاتی معیار) ایک علیحدہ نظام کی تشکیل کرتے ہیں جو مذہب کے دائرہ سے خارج ہوتا ہے، ایجابی علوم جیسے ریاضیات، طبعیات علم الحیات، نفسیات، عمرانیات، صنعتی طریقے اور فنون لطیفہ کا مذاہب سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، چنانچہ کسی تہذیب کا بھی مذہب سے انتساب درست نہیں ہے۔ نہ مسیحی تہذیب کا وجود ہے نہ اسلامی تہذیب کا، ٹھیک جس طرح سے مغربی تہذیب کو مسیحی تہذیب کہنا صحیح نہیں، اسی طرح مشرقی تہذیب کو اسلامی تہذیب کہنا بھی درست نہیں۔[3]"

اس انقلاب انگیز اقدام کے لئے وہ روس کی مثال دیتا ہے، جس نے قدامت پسند کٹر مسیحی

---

[1] TURKISH NATIONALISM AND WESTERN CIVILIZATION, P. 271

[2] - - - - - P. 269-270

[3] - - - - - P. 271-272

کلیسا کی پیروی اور مشرقی رنگ کی تہذیب سے تعلق رکھنے کے باوجود ترقی یافتہ مغربی تہذیب کو اختیار کیا اور مغرب کی آزاد و طاقتور قوموں کی صف میں کھڑا ہوگیا، وہ لکھتا ہے:۔

"جب اہل مغرب نے اپنے کو قرون وسطیٰ کے اثرات سے آزاد کیا اس وقت روس کے آرتھوڈکس عیسائی اپنے کو آرتھوڈکس چرچ کا غلام سمجھتے تھے، چنانچہ روسی قوم کو بیزنطینی تہذیب سے آزاد کرنے میں اور مغربی تہذیب سے آشنا کرنے میں پطرس اعظم کو سخت دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا، یہ جاننے کے لئے کہ کسی ملک کو نمونۂ مغرب بنانے اور اسکو یورپ کے رنگ میں رنگنے کے لئے کیا وسائل و اسباب اختیار کئے جا سکتے ہیں، تاریخ اصلاحات پطرس کا مطالعہ کرنا چاہئے اس زمانہ میں لوگوں کا خیال تھا کہ روسی ترقی کے اہل نہیں ہیں، لیکن اس انقلاب کے بعد انہوں نے بڑی تیزی کے ساتھ ترقی کے مراحل طے کئے، یہ تاریخی حقیقت اس بات کے ثبوت کے لئے بالکل کافی ہے کہ مغربی تہذیب ہی ترقی کی واحد شاہراہ ہے[1]..."

پھر وہ یہ ثابت کرتے ہوئے کہ آزادی اور قومی وقار کی حفاظت کے لئے مغربی تہذیب پر اپنا اقتدار قائم کرنا ضروری ہے، لکھتا ہے:۔

"ہم کو دو میں سے ایک راستہ لامحالہ اختیار کرنا ہوگا، یا تو ہم مغربی تمدن قبول کریں یا مغربی طاقتوں کا غلام رہنا پسند کریں۔ ہمیں ایک بات کا فیصلہ کرنا ضروری ہے، ہمارے لئے لازم ہے کہ ہم اپنی حریت کی حفاظت کے لئے مغربی تہذیب پر اپنی سیادت قائم کریں[2]..."

ضیا گوک الپ ترکی جدید کے فکری معماروں میں اہم ترین حیثیت رکھتا ہے، اس نے وہ فکری اساس اور جدید نقطۂ نظر مہیا کیا، جس پر ذہنی و اصولی حیثیت سے اس جدید ریاست اور جدید معاشرہ کی بنیاد رکھی گئی، پروفیسر نیازی برکس نے اس کے منتخب مضامین کا جو مجموعہ شائع کیا ہے اس کے مقدمہ میں اس حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ ترکی کی جدید اصلاحات کے اساسی نکات پر اسی کا انداز فکر

---

[1] TURKISH NATIONALISM AND WESTERN CIVILIZATION. P. 275

[2] " " " " " P. 266

اب تک چھایا ہوا ہے ، وہ کہتے ہیں :-

"اگرچہ ضیا گوک الپ کا انتقال اتاترک کے انقلابی اصلاحات کے ابتدائی دور ہی میں ہو گیا تھا۔ لیکن ان کی تحریروں میں وہ خیالات پائے جاتے ہیں جنہیں ان اصلاحات کی بنیاد کہا جا سکتا ہے ، اسلامی اصلاح کے سلسلہ میں ان کے خیالات کو سب سے زیادہ نقصان شدت پسند سیکولرازم کے اس عہد میں ہوا جو ان کے بعد فوراً ہی شروع ہو گیا تھا۔ پھر بھی بہر حال میرے نزدیک اگر وہ زندہ رہتے تو اتاترک کی پالیسی سے اپنے کو رضامند کر لینے میں کامیاب ہو جاتے ، کیونکہ خلافت کے متعلق ان کے تصورات ان کے مغربی قومیت کے نظریہ کے منطقی نتائج سے یوں ہی مختلف تھے ، خلافت کے موضوع پر ان کے تصورات زیادہ تر ترکی قوم پرستی کو ایک آفاقی اور بین الاقوامی بنیاد دینے کی کوشش میں "خیالستانوں" پر مبنی تھے ، اس کے علاوہ ہم جانتے ہیں کہ دستور میں سیکولرازم اور آزادی ضمیر اور آزادی فکر کی جو دفعات ہیں وہ انہیں کے قلم سے نکلی ہوئی ہیں کیونکہ ۱۹۲۴ء میں جو بنیادی دستور اساسی بنانے کیلئے کمیٹی مقرر کی گئی تھی وہ اس کے ایک ممبر تھے۔ اتاترک نے مثالی اصلاح کی جو انقلابی پالیسی اختیار کی تھی اس سے وہ اپنے کو شاید ہم آہنگ نہ کر پاتے ...... اگرچہ عمل میں ان کے بعض نظریات سے ہٹ لیا گیا ہو پھر بھی ترکی کی جدید اصلاحات کے اساسی نکات پر انہیں کا انداز فکر اب تک چھایا ہوا ہے۔"

آگے چل کر وہ ضیا گوک الپ کا فکری و علمی کردار بیان کرتے ہوئے ایک فکری قائد اور ایک مکتب فکر کے بانی کی حیثیت سے انکی اہمیت کو اسطرح واضح کرتے ہیں :-

اگرچہ موجودہ عہد کے ترکی اور بیرونی عالموں کی تصنیفات کے مقابلہ میں تاریخ ، عوامی تمدن اور اجتماعیات پر انکی خود تحقیقات زیادہ وقعت نہیں رکھتی ہیں ، لیکن اس سے راستہ کے امام اور بانی ہونے کی حیثیت سے ان کے مرتبہ میں مطلق کوئی فرق نہیں آتا ہے ، اگر ان کے بعض تصورات جدید ترکی میں آج بھلا دئے گئے ہیں ، یا اگر وہ آج معمولی سمجھے جاتے ہیں اور ان میں پوری ندرت نہیں نظر آتی ہے۔ جبکہ ان کے زمانہ میں وہ نئے اور اچھوتے خیال کئے جاتے تھے تو اس کا سبب یہ ہے کہ یہ نظریات اب حقائق بن گئے ہیں اس سبب سے ان کے اثر کی گہرائی اور انکی نظر کی وسعت کا پتہ چلتا ہے۔"

مولانا قاری سعید الرحمٰن خطیب جامعہ اسلامیہ
کشمیر روڈ ۔ راولپنڈی صدر

شیخ الحدیث مولانا نصیر الدین غورغشتی مدظلہ

ایک شخصیت ---------- ایک عہد ---------- ایک تاریخ

علمی تاریخ کا ایک روشن باب، پیکرِ معصومیت و جمال، مجسمۂ اخلاص وللّٰہیت، دین کیلئے سراپا فکر، حدیث کا بے لوث خادم اور پٹھانوں کے شاہ ولی اللہؒ۔

دریائے سندھ کے مشرقی کنارے پر تربیلہ اور غازی سے چند میل دور علاقہ چھچھ کا آخری شرقی قصبہ غورغشتی واقع ہے۔ غورغشتی کے اکثر باشندے افغان قبیلہ "کاکڑ" سے تعلق رکھتے ہیں۔ صدیوں پہلے اس قبیلہ کے ایک سردار شیخ محمد اشرف کی سرکردگی میں تقریباً چار ہزار افغان مجاہدین کی جماعت قندھار سے جہاد کے لئے ہندوستان آئی۔ پانی پت کرنال اور بعض دوسرے علاقوں میں فوجی یورشوں کے بعد واپس وطن جاتے ہوئے یہ لوگ غورغشتی اور اردگرد علاقوں میں بس گئے۔ یہ قصبہ پٹھانوں کی روایات، غیرت وحمیّت، بہادری وجفاکشی اور پھر علم وفضل اور طریقت ومشیخت ہر معاملہ میں امتیازی شان کا حامل رہا ہے۔ بڑے بڑے مشائخ وصوفیاء یہاں گذرے ہیں۔ جو طالبانِ حق اور گم کردہ راہوں کیلئے طمانیت اور ہدایت کا سامان مہیا کرتے۔ مشاہیر علماء وفضلاء کے یہاں تقریباً ہر دور میں علم وفضل کی محفلیں جمی رہتیں۔ ایک وقت تھا کہ دور دراز سے علم وفضل کے پیاسے یہاں آکر اپنی تشنگی دور کیا کرتے۔ اور وسعت کے مطابق اپنے دامنوں کو جواہر پاروں سے بھر کرلے جاتے، یہ تو پرانے دور کی باتیں ہیں۔

اس دور میں غورغشتی کی شہرت حضرت بقیۃ السلف فخر المحدثین شیخ الحدیث مولانا نصیر الدین صاحب مدظلہٗ کی ذات بابرکات سے ہے۔ حضرت ممدوح کی متوکلانہ زندگی، بے تکلف

معاشرت اور سادہ رہن سہن کو دیکھ کر قرون اولیٰ کے علماء و محدثین کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ زندگی میں تکلف و تصنع، ریا اور نمود کا نام و نشان تک نہیں۔ حضرت کا معصوم چہرہ اذا رأوا ذکر اللہ کا صحیح مصداق ہے۔ ساری زندگی خلوت و گوشہ نشینی اور انقطاع الی اللہ میں گذری۔ علم حدیث کی مسلسل نصف صدی تک خدمت کیوجہ سے روح عشق نبوی میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اتباع سنت کا جذبہ ہر عمل و کردار میں نمایاں ہے۔ اعضاء و جوارح میں ضعف و کمزوری کے باوجود قلب و دماغ ہر وقت فکر دین میں مصروف ہیں۔

اس مرد درویش نے جس خاموشی، تندہی، یکسوئی اور ظاہری نشوو نما اور دنیوی منفعتوں سے بے نیاز ہو کر جسطرح حدیث نبوی کی خدمت کی ہے۔ اس کا تصور بھی اس دور میں نہیں کیا جا سکتا۔ ساری زندگی توکل میں بسر کی تدریسی زندگی کے چند ابتدائی سالوں کے علاوہ تقریباً چالیس سال بغیر کسی دنیوی منفعت کے اپنے قصبہ غورغشتی میں ہزاروں تشنگان علوم کی سیرابی آپ کی حیات مبارکہ کا ایک ستہرا باب ہے۔ آپ کا قیام آجکل اپنی مسجد ہی میں رہتا ہے۔ مسجد کے بائیں طرف آپ کا کمرہ ہے ۔۔۔ یذکرون اللہ قیاماً وقعوداً وعلیٰ جنوبہم ویتفکرون ۔ الخ کے مطابق سارا وقت عبادات اور ذکر و فکر میں صرف ہوتا ہے۔ واردین و صادرین سے باوجود ضعف کے انتہائی بشاشت کیساتھ ملاقات فرماتے ہیں۔ چڑچڑاپن نام کو بھی نہیں۔ طبیعت میں تحمل اور چھوٹوں پر شفقت بہت زیادہ ہے۔ بارہا خیال ہوا کہ حضرت کی خدمت میں حاضر ہو کر زندگی کے کچھ حالات معلوم کئے جائیں۔ تاکہ اس قحط الرجال کے دور میں اپنے اسلاف اور بزرگوں کے حالات سے کچھ واقفیت حاصل کی جا سکے۔۔۔ ویسے تو عموماً حاضری ہوتی رہتی ہے۔ اور حضرت والد صاحبؒ (حضرت شیخ الحدیث مولانا عبد الرحمن صاحب کاملپوریؒ) سے خصوصی تعلق و محبت کی وجہ سے نہایت کرم فرماتے ہیں۔ اس مقصد کیلئے حاضری میں اندیشہ محسوس کر رہا تھا کہ کہیں اظہار حالات حضرت کی طبع لطیف پر ناگوار نہ ہو۔ اس لئے خود ہی زندگی کے بعض واقعات کے بارے میں غیر مرتب طریقہ سے کچھ باتیں دریافت کیں۔ حضرت بڑی بشاشت و محبت سے جواب دے رہے تھے جس سے ڈھارس بندھی۔ اور عرض کیا، حضرت کچھ اپنی زندگی کے بارے میں ارشاد فرمائیں، تاکہ ہم جیسوں کیلئے مشعل راہ اور ہدایت کا ذریعہ بنے۔ حضرت چارپائی پر لیٹے ہوئے تھے۔ یہ درخواست سنکر بیٹھ گئے اور بے تکلفی سے فرمانے لگے۔ میرے کوئی لمبے چوڑے حالات نہیں ہیں۔ اور نہ

ان میں کوئی خاص بات ہے۔ مگر عرض کیا۔ حضرت نے درخواست قبول فرمائی۔ ضعف و کمزوری اور پیرانہ سالی سے بیٹھے رہنے پر بار محسوس ہونے لگا۔ اس لئے عرض کیا گیا کہ حضرت چارپائی پر لیٹے رہیں۔ اور لیٹے ہی ارشاد فرمائیں۔ چنانچہ حضرت نے اپنی زندگی کے یہ مختصر حالات ارشاد فرمائے :

سلسلۂ نسب اور خاندان | حضرت کا سلسلۂ نسب اسطرح ہے۔ حضرت مولانا نصیر الدین صاحب ولد مولانا بہاؤ الدین صاحب ولد مولانا سعد الدین صاحب ولد محمد موسیٰ صاحب ولد اخوند محمد بشارت صاحب۔

آپ کا خاندان قدیم زمانہ سے علم و مشیخت، فضل و کمال اور طریقت و معرفت، نیز ظاہری عزت و شوکت میں ممتاز خاندان رہا ہے۔ آپ کے والد محترم مولنا بہاؤ الدین صاحب سلسلۂ چشتیہ کے مشہور صاحب نسبت بزرگ گذرے ہیں۔ طریقت و معرفت کے علاوہ جامع عالم و فاضل تھے۔ تفسیر میں امتیازی حیثیت رکھتے تھے۔ علم حدیث کے علاوہ سب علوم میں مہارت کاملہ رکھتے تھے۔ اس علاقہ میں علم حدیث کی تدریس کا رواج اسوقت نہ تھا۔ زیادہ توجہ فقہ تفسیر منطق فلسفہ اور دیگر علوم آلیہ کیطرف ہوئی۔ (کہا معلوم تھا کہ یہ کمی آپ کے لائق فائق صاحبزادے کے ذریعہ پُر ہونا ہے) علوم ظاہریہ و باطنیہ دونوں کے پیاسے آپ کے پاس آکر اپنی تشنگی دور کرتے۔ حضرت شیخ الحدیث صاحب فرماتے ہیں کہ طالبین علوم ظاہریہ کے ساتھ ساتھ معرفت و سلوک کے متلاشی بھی آپ کی خدمت میں حاضر رہتے۔ مگر دوسرے حضرات کی طرح لنگر اور خورد و نوش کا روایتی اور رسمی طریقہ پر انتظام نہ تھا۔ بلکہ سادگی اور نام و نمود سے تنفر ہر پہلو پر نمایاں رہتا۔ اٹک شریف کے مشہور معقولی عالم و استاذ مولنا غلام رسول صاحب جنکا بڑا فیض جاری ہوا، مولنا بہاؤ الدین صاحب ہی کے شاگرد اور باطنی فیض یافتہ تھے۔ اٹک شریف کے خاندان نے آخر تک اس علمی خاندان سے اپنے تعلق کو نبھایا۔

مولنا بہاؤ الدین صاحب اپنے والد ماجد مولنا سعد الدین صاحب کے شاگرد بھی تھے۔ اور مرید بھی۔ خلافت آپ کو اپنے والد ماجد ہی سے ملی۔

حضرت شیخ الحدیث صاحب کے دادا مولنا سعد الدین صاحب جو "اخوان صاحب" کے نام سے مشہور تھے بڑے پایہ کے بزرگ گذرے ہیں۔ آپ حضرت سوات بابا حاجی عبد الغفور اخوند صاحب سوات کے ہم قرن تھے۔ اخوند صاحب فرمایا کرتے تھے کہ علاقہ چھچھ

میں جب "اخوان صاحب" موجود ہیں تو پھر کے لوگوں کو میرے پاس آنے کی کیا ضرورت ہے۔

ولادت | کیا معلوم تھا کہ مولانا نصیر الدین صاحب آگے چل کر ایک صاحبِ فیض عالم اور صاحب سلسلہ شیخ کی حیثیت سے نمودار ہوں گے۔ کسی نے سنِ ولادت محفوظ رکھنے کیطرف توجہ نہ دی۔ جیسا کہ عموماً اس علاقہ میں ہوتا تھا۔

مگر حضرت نے خود بعض قرائن سے اپنا سنِ ولادت ۱۲۹۵ھ بیان فرمایا۔ حضرت فرماتے ہیں کہ میرے دادا صاحب کا انتقال ۱۳۰۹ھ میں ہوا مجھے اتنا یاد ہے کہ اس وقت میری عمر ۱۴ سال کی تھی، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۲۹۵ھ میں ولادت ہوئی۔

ابتدائی تعلیم | چونکہ یہ علمی خانوادہ تھا۔ اس لئے حصولِ تعلیم کے لئے[1] آپ کو پہلے باہر جانے کی ضرورت نہ پڑی۔ آپ نے قرآنِ مجید، فارسی کی کتابیں، نامِ حق، نظم گلستان وغیرہ اپنے بھائی مولانا شہاب الدین صاحب سے پڑھی۔

حضرت فرماتے ہیں: کہ دورانِ تعلیم سنا کرتا تھا کہ "ہندکو"[2] میں صرف ونحو کی کتابیں اچھی ہوتی ہیں۔ اس لئے صرف ونحو کی تعلیم کیلئے علاقہ "ہندکو" کے ایک گاؤں "سروبہ" گیا، وہاں کے استاذ سے نحو میر اور دوسری نحو وصرف کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ "سروبہ" میں قیام کے دوران علاقہ "ملے" ملتان کی شہرت سنی کہ وہاں ان فنون کے ماہر اساتذہ ہیں۔ چنانچہ وہاں کچھ عرصہ رہ کر مائۃ عامل ہدایۃ النحو کافیہ وغیرہ کتابیں پڑھیں۔ حضرت فرماتے ہیں: کہ اس کے بعد میں انہی شریف کے استاذ مولنا غلام رسول صاحب کے پاس شرح جامی حاشیہ عبد الغفور اور علم معانی وغیرہ کی تعلیم کے لئے گیا۔ انہی کے استاذ صاحب اس وقت ضلع کیمل پور کے ایک گاؤں "نوتھ" کے ایک مدرسہ میں پڑھایا کرتے تھے۔ نوتھ کے ایک عالم مولنا سلطان احمد صاحب بڑے مشہور واعظ تھے۔ وہ مختلف بستیوں اور علاقوں میں وعظ کے لئے جایا کرتے۔ انہوں نے اپنے گاؤں میں ایک مدرسہ قائم کیا ہوا تھا۔ انہی کے استاذ صاحب وہاں پڑھایا کرتے تھے حضرت شیخ الحدیث صاحب فرماتے ہیں۔ کہ میں ان کی خدمت میں "نوتھ" حاضر ہوا۔ بڑی شفقت و محبت سے پیش آئے۔ فرمانے لگے کہ تم میرے مرشد اور استاذ کے صاحبزادے ہو۔ اس لئے

---

[1] آپ کے صاحبزادے مولانا قطب الدین صاحب مشہور علام فلسفہ ومنطق وریاضی میں بڑے ماہر اور صاحب فن گزرے ہیں۔ دورۂ حدیث آپ نے حضرت مولنا رشید احمد صاحب گنگوہی سے پڑھا تھا۔

[2] پنڈی گھیپ فتح جنگ۔

تم میرے گھر کے ایک فرد کی طرح رہو گے ۔ تمہارا کھانا ہمارے گھر سے آیا کرے گا ۔ ان کی خدمت میں رہ کر علم نحو منطق اور معانی کی تکمیل کی ۔

دورۂ حدیث | انہی کے استاذ مولانا غلام رسول صاحب سے مختلف علوم کی کتابیں پڑھنے کے بعد دورۂ حدیث کیلئے آپ ضلع میانوالی کے قصبہ چکڑالہ ۔ مولانا قاضی قمرالدین صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے ۔ مولانا قاضی قمرالدین صاحب مشہور محدث اور صاحب مقامات بزرگ گذرے ہیں ۔ آپ نے حدیث مولانا احمد حسن صاحب امروہی سے پڑھی تھی ۔ جو حضرت حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی ؒ کے خاص تلامذہ و مریدین میں سے تھے ۔

قاضی صاحب حضرت خواجہ محمد سلیمان صاحب ؒ موسیٰ زئی (ضلع ڈیرہ اسماعیل خان) کے خلیفہ تھے ۔ حضرت شیخ الحدیث صاحب فرماتے ہیں کہ دوران درس حضرت قاضی صاحب اپنے مرشد کی بہت تعریف فرمایا کرتے تھے ۔ اس لئے مجھے بھی خیال آیا کہ میں بھی حضرت خواجہ صاحب سے بیعت ہو جاؤں ، مگر اس سال حضرت خواجہ صاحب کا انتقال ہو گیا ۔ اور بیعت نہ ہو سکا ۔

مرشد اول کا انتخاب | خواجہ محمد سلیمان صاحب کے انتقال کے بعد آپ کے صاحبزادے خواجہ سراج الدین صاحب آپ کے خلیفہ اور جانشین ہوئے ۔ اس سلسلہ کے طریقہ کے مطابق قاضی صاحب نے خواجہ سراج الدین صاحب ؒ سے تجدید بیعت کی ۔ اور مکمل کئے ۔ حضرت شیخ الحدیث صاحب فرماتے ہیں : کہ میں بھی قاضی صاحب کے ہمراہ حضرت خواجہ سراج الدین صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا ۔ اور بیعت کر لی ۔ مگر حضرت خواجہ سراج الدین صاحب جوانی ہی میں وفات پا گئے ۔

مرشد ثانی کا انتخاب | حضرت شیخ الحدیث صاحب فرماتے ہیں : حضرت خواجہ صاحب کے انتقال کے بعد حضرت مولانا حسین علی صاحب ؒ کی شہرت سن کر ان کی خدمت میں حاضر ہوا ۔ حضرت مولانا حسین علی صاحب حضرت قاضی قمرالدین کے مشورہ سے حضرت خواجہ محمد سلیمان صاحب سے بیعت ہوتے تھے ۔ حضرت خواجہ سراج الدین صاحب حضرت مولانا حسین صاحب کے شاگرد تھے مگر حضرت خواجہ سلیمان صاحب کے انتقال کے بعد جب خواجہ سراج الدین صاحب خلیفہ ہوئے تو حضرت مولانا حسین علی صاحب نے بھی سلسلہ کے طریقہ کے مطابق اپنے تلمیذ سے تجدید بیعت کی ۔ حضرت مولانا حسین علی

صاحبؒ سال میں دو بار ضرور حضرت خواجہ محمد سلیمان صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتے۔

واں بچھراں میں حضرت شیخ الحدیث صاحب کا کافی قیام رہا۔ زیادہ تر آپ سلوک و معرفت کیلئے شیخ کی خدمت میں مقیم رہے۔

حضرت شیخ الحدیث صاحب فرماتے ہیں: کہ حضرت مولنا قمرالدین صاحبؒ اور حضرت مولانا حسین علی صاحبؒ بڑے پایہ کے بزرگ اور بہت حلیم الطبع اور متحمل مزاج تھے۔ طلبہ اور عوام دونوں سے بڑی ملنساری سے پیش آتے۔ مگر حضرت مولانا حسین علی صاحب اگر کہیں شرک و بدعت اور رسوم کیطرف میلان دیکھتے تو جلال میں آجاتے۔ ساری زندگی آپ کی شرک و بدعت اور غلط رسوم کے استیصال میں گذری۔ اس بارے میں آپ کی خدمات ممتاز ہیں۔

سفر رنگون | علوم عقلیہ و نقلیہ سے فراغت کے بعد آپ اپنے وطن غورغشتی آکر تدریس میں مشغول ہوگئے۔ چند سال آپ نے صرف و نحو معانی اور دیگر علوم کی تدریس میں صرف کئے۔

نوبتھ کے عالم مولانا سلطان احمد صاحب کا حال گذشتہ سطور میں معلوم کرچکے ہیں۔ یہ مشہور واعظ تھے۔ ان کی آمد و رفت رنگون میں رہی۔ وہاں کے کافی لوگ ان کے معتقد تھے۔ لوگوں کے اصرار پر آپ نے رنگون کی ایک جامع مسجد کے ساتھ ایک مدرسہ کی بنیاد رکھی۔ حضرت شیخ الحدیث صاحب نے فرمایا کہ میں نوبتھ میں اپنی شریف کے استاذ مولنا غلام رسول کی خدمت میں قیام کرچکا تھا۔ اس لئے مولانا سلطان احمد صاحب سے بخوبی واقفیت تھی۔ انہوں نے مجھے رنگون کے مدرسہ میں تدریس کی دعوت دی۔ چنانچہ میں نے دعوت قبول کرلی۔ اور متفرق طور پر چند سال وہاں تدریس میں مشغول رہا۔

سفر حج | رنگون کے قیام کے دوران ہی حج کی سعادت سے مشرف ہوئے۔ فرمایا کہ اس وقت حجاز میں سلطان عبدالحمید خان کی حکومت تھی، عجیب دور تھا۔ اس زمانہ میں روس کے مسلمانوں پر ظلم و ستم کی داستانیں زبان زد خلائق تھیں۔ روسی مسلمان مہاجرین کے قافلے حجاز ہندوستان اور دوسرے ممالک میں آرہے تھے۔

دیوبند حاضری | فرمایا: رنگون اور دوسرے مختلف مقامات پر دارالعلوم دیوبند اور حضرت شیخ الہندؒ کی شہرت سنا کرتا تھا۔ دل میں بڑی عظمت تھی، اور ساتھ ہی ساتھ علمی طور

پر عربیت بھی تھی۔ رنگون میں قیام کے دوران جب کوئی دیوبند سے پڑھا ہوا عالم آتا، تو دیوبند کی شہرت اور علمی ساکھ کی وجہ سے مسائل میں ان سے بحث میں احتراز کرتے کہ یہ بڑی جگہ کے پڑھے ہوتے ہیں۔ یہ خداداد علمی شان تھی جو دارالعلوم دیوبند کو من جانب اللہ عطا ہوئی تھی۔ دل میں بارہا خواہش پیدا ہوئی کہ موقع ملے تو دیوبند حاضر ہو کر حضرت شیخ الہندؒ سے استفادہ کروں۔ چنانچہ اسی ارادہ سے رنگون سے واپسی پر دیوبند اترا۔ حضرت شیخ الہندؒ نے ترمذی شریف ہدایہ آخرین، توضیح و تلویح میں داخلہ کا امتحان لیا۔ حضرت شیخ الہندؒ کے الفاظ ابھی تک یاد ہیں کہ طالب علم لائق نظر آتا ہے۔" دیوبند میں تین چار ہفتہ قیام رہا۔ فرماتے ہیں: کہ چونکہ اس سے قبل حدیث کے درس و تدریس میں کافی عرصہ تک مشغولیت رہی تھی۔ جو معلومات تھیں اس سے زیادہ کا اضافہ نظر نہ آیا۔ نیز طبیعت بھی خراب ہو گئی تھی۔ اس لئے واپس آگیا۔

غورغشتی دوبارہ آمد | دیوبند سے واپسی پر نوتھ میں اپنی استاذ صاحب کی خدمت میں کچھ دن قیام رہا۔ اور پھر غورغشتی میں مستقل قیام کے ارادہ سے آگیا۔ اور درس حدیث کا آغاز کر دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے چاروں طرف سے طلبہ و علماء امڈ پڑے۔ فارسی اور پشتو بولنے والے حضرات علماء و طلبہ نے خصوصیت سے حضرت کی طرف رجوع کیا۔ یہ حضرت کے خلوص و للہیت کی کھلی نشانی ہے۔ کہ اس دور دراز قصبہ میں صوبہ سرحد قبائلی علاقے اور افغانستان اور ترکستان کے بیشتر حصوں کے طلبہ کے قلوب آپ کی طرف منجذب ہوئے اور حضرت کا فیض عام ہوا۔ غورغشتی میں تقریباً چالیس سال تک مسلسل آپ نے درس حدیث دیا۔ مختلف سالوں میں ساٹھ سے لیکر ڈیڑھ دو سو تک طلبہ آپ کے پاس مقیم رہے۔

حضرت کے اندازہ کے مطابق اس طویل عرصہ میں کم از کم پانچ ہزار کے قریب طلبہ نے براہِ راست آپ سے حدیث پڑھی۔ بلاواسطہ تلامذہ کا شمار مشکل ہے۔ اس دور میں اسلاف کے نمونہ پر بغیر کسی دنیوی طمع و نفع کے علم حدیث کی یہ خدمت آپ کے لئے آخرت کا بہترین اور قیمتی سرمایہ ہے۔

علم حدیث سے خصوصی لگاؤ اور شغف کی وجہ سے اتباع سنت کا جذبہ بڑا نمایاں ہے۔ بدعت سے طبیعت میں شدید تنفر ہے۔ مگر ساتھ ساتھ ہر معاملہ میں حزم و احتیاط

اعتدال اور میانہ روی بھی حضرت کی ایک خصوصی شان ہے۔ تحریک ختم نبوت کے موقع پر حضرت نے باوجود ضعف و کمزوری کے قید و بند کی مصائب جھیلیں۔ اس دور میں ایک عجیب جوش اور ولولہ ظاہر ہوتا تھا۔

تصنیفی خدمات | آپ نے حدیث کی مشہور کتاب مشکوٰۃ شریف پر حاشیہ قلمبند فرمایا۔ صورت یہ ہوتی تھی کہ مختلف کتب کے مطالعہ کے بعد پھر اس کا نچوڑ اور خلاصہ املاء فرمایا کرتے تھے۔ اور پھر خود اسکی تصحیح فرماتے۔ مشکوٰۃ شریف کا یہ حاشیہ حضرت نے بڑی عرق ریزی سے مرتب فرمایا۔ پشاور کے ایک ناشر نے اس کو طبع کرایا تھا۔ مگر وہ حضرت کے حسب منشاء نہیں تھا۔ مطبع مجتبائی دہلی والوں نے بھی اس کے طبع کا ارادہ کیا تھا۔ مگر تقسیم ملک کی وجہ سے معرض التوا میں پڑگیا۔ حضرت نے بڑی دل سوزی سے فرمایا کہ کاش! کوئی مخلص مطبع والے اسکو طبع کراتے تو میری آنکھوں کو ٹھنڈک ہوتی۔

ایک سوال کے جواب میں حضرت نے فرمایا کہ اس دور میں اسلام کے خلاف جسقدر سازشیں ہورہی ہیں۔ اسکی نظیر گذشتہ تاریخوں میں نہیں ملتی۔ باطل جسطرح منظم ہو کر حق پر حملہ آور ہورہا ہے۔ یہ بڑی خطرناک بات ہے۔ عرض کیا کہ اس موقعہ پر عوام اور علماء کو کیا کرنا چاہیئے۔ فرمایا: عوام کو قرآن و حدیث کی صحیح سمجھ حاصل کرنی چاہیئے۔ اگر فطرت سلیمہ ہو تو قرآن و حدیث تذکیر اور فرق باطلہ سے محفوظ رہنے کیلئے مضبوط ڈھال ہیں۔ علماء اپنی قوت و استطاعت کے مطابق جدوجہد کرتے رہیں۔ اور ساتھ ساتھ انفرادی طور پر ارشاد ربانی :— فاتقوا اللہ ما استطعتم (ڈر اللہ سے جسقدر تم طاقت رکھو) اور فرمان نبوی ؐ— اذا رایت شحاً مطاعاً و ھویً متبعاً — الی قولہ — و اعجاب کل ذی رای برایہ فعلیک بخویصۃ نفسک — الخ کے مطابق اپنے نفس کی فکر کرنی چاہیئے۔ کہ اب وہ دور آرہا ہے کہ اپنا نفس ہی اگر بچ جائے تو بڑا غنیمت ہے۔ ایک سوال کے جواب میں فرمایا کہ میری قلبی خواہش ہے کہ علماء فروعی مسائل میں زیادہ وقت ضائع نہ کریں۔ بلکہ فرق باطلہ کے سامنے بنیان مرصوص کیطرح ڈٹ جائیں — فرمایا، علماء کا فروعی مسائل میں افتراق اور انتشار فرق باطلہ کو آگے بڑھنے کا موقع فراہم کر رہا ہے۔ فرمایا: دراصل آج ایسی مرکزی شخصیتیں بھی نہ رہیں جو سب کو ایک مرکز پر جمع کرانیکا ذریعہ بن سکیں — ایک سوال کے جواب میں فرمایا کہ کاش! ارباب حکومت کے ذہن میں یہ بات آجاتی کہ مسلمانوں کی بھلائی صرف اسلام میں ہے۔ اور اسی کی پناہ میں آکر ہم دین و دنیا کے ہر مسئلہ کو حل کر سکتے ہیں۔

تحریر:- جناب علامہ محمد اسد صاحب (جرمنی)
ترجمہ:- جناب محمد معین خاں بی۔ اے (عثمانیہ)۔ اسلام آباد

اسلام میں حدیث اور سنت کا مقام

ذیل میں عالم اسلام کے ممتاز عالم اور سکالر جناب محمد اسد صاحب (نومسلم) حال متوطن اسٹریا (یورپ) کی شہرۂ آفاق کتاب اسلام ایٹ دی کراس روڈ* (ISLAM AT THE CROSS ROAD) کے ایک باب کا ترجمہ پیش کیا جارہا ہے۔ اس کتاب کی قدر و منزلت کے بارہ میں صرف اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ یہ علامہ محمد اقبال، محترم مارماڈیوک محمد پکتھال، علامہ سید سلیمان ندوی اور مولانا ابوالحسن علی ندوی جیسے مشاہیر علماء سے داد تحسین حاصل کر چکی ہے۔

★

قرون گذشتہ کے دوران اصلاح مذہبی کی کئی تجویزیں پیش ہوئیں اور کئی روحانی طبیبوں نے اسلام کے جسد بیمار کے لئے ایک پیٹنٹ دوا ایجاد کرنے کی کوششیں بھی کیں لیکن تاحال ہر تجویز بے سود اور ہر سعی نامشکور ثابت ہوئی، کیونکہ یہ تمام باکمال طبیب اپنی ادویات اور اکسیر و مقویات کے ساتھ وہ قدرتی غذا تجویز کرنا ہمیشہ فراموش کرتے رہے جس پر مریض کی ابتدائی شفاء پذیری کی بنیادیں استوار کی گئی تھیں۔ یہ قدرتی غذا ہمارے نبی کریم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مبارکہ ہے اور صرف یہی وہ واحد غذا ہے جو جسد اسلام تندرستی یا بیماری ہر دو حالتوں میں قطعی طور پر قبول کر سکتا ہے۔ سنت تیرہ سو برس سے بھی پہلے کے اسلامی عروج و کمال کو سمجھنے کی کلید ہے۔ پھر یہ ہماری موجودہ پستی و زوال کو سمجھنے کی کلید کیوں نہیں ہو سکتی۔

---

* اسلام کا شجرۂ طوبیٰ اپنی ذات کے لحاظ سے ہمیشہ سدابہار رہے گا۔ یہاں مسلمانوں کے دینی زوال اور اضمحلال کی بنا پر مجازاً جسد اسلام کو مصنف نے بیمار کی نسبت دی ہے جسے حدیث میں بدأ الاسلام غریباً سے تعبیر کیا گیا۔ مدیر

اتباعِ سنت وجود و ترقی اسلام کے مترادف ہے اور سنت سے تغافل انتشار و انحطاطِ اسلام کے مترادف ہے۔ سنت قصرِ اسلام کا آہنی چوکھٹا ہے۔ آپ کسی عمارت سے اس کا چوکھٹا نکال دیں اور وہ عمارت تاش کے پتوں کی طرح منہدم ہو جائے تو کیا آپ کو اس پہ کوئی حیرت ہو سکتی ہے؟

یہ سیدھی سی صداقت جسے تاریخِ اسلام کے ہر دور کے علماء بالاتفاق قبول کرتے چلے آئے ہیں، آج ان وجوہ و اسباب کی بناء پر جن کا تعلق مغربی تہذیب کے روز افزوں اثرات سے ہے، بے انتہا غیر مقبول بن گئی ہے۔ لیکن یاد رکھئے کہ یہی اور صرف یہی وہ صداقت ہے جو ہمیں اپنی موجودہ پستی کے اختلال سے محفوظ رکھ سکتی ہے۔ اور اس پستی کی ندامت سے ہمیں بچا سکتی ہے۔

قرآن کا حق سنت کے اتباع ہی سے ادا ہو سکتا ہے۔ | سنت کا لفظ یہاں اس کے وسیع ترین معنی میں استعمال کیا جا رہا ہے۔ یعنی وہ نمونہ جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اقوال و افعال میں ہمارے لیے قائم فرمایا ہے۔ آپ کی معجز نما حیاتِ طیبہ قرآن مجید کی جیتی جاگتی شرح و تفسیر تھی ہم اس کتابِ مقدس کا حق اس سے زیادہ ادا نہیں کر سکتے کہ ہم اس ہستی مطہر کی اتباع کریں جو اس کتاب کے نزول و ابلاغ کا ذریعہ بنی تھی۔

ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ اسلام کا ایک عظیم کارنامہ جو اسے دیگر تمام مادرائی نظاموں سے متمیز و ممتاز کرتا ہے وہ حیاتِ انسانی کے اخلاقی اور مادی پہلوؤں کے مابین مکمل ہم آہنگی ہے۔ یہ ان اسباب میں سے ایک ہے جن کی بناء پر اسلام اپنے صدرِ اول میں جہاں جہاں گیا فتح مبین سے ہم کنار ہوتا رہا۔ اس نے نوعِ بشر کو یہ نیا پیغام دیا، کہ آسمان کے حصول کے لئے زمین کی تحقیر کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کی اس نمایاں خصوصیت سے اس امر کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حیثیت داعیاً الی اللہ کے انسانی زندگی کے روحانی اور مادی ہر دو متضاد مظاہر کی یک جائی سے اسقدر گہرا تعلقِ خاطر کیوں تھا۔ اسی لئے جو شخص آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ احکام جو خالص عبادات اور روحانی معاملات سے تعلق رکھتے ہیں، اور وہ احکام جو ہمارے سماجی اور روزمرہ زندگی کے مسائل سے تعلق رکھتے ہیں، ان دونوں میں کوئی فرق و امتیاز قائم کرتا ہے۔ تو اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کے بارہ میں اسکی فہم و آگاہی زیادہ گہری نہیں ہے۔

منصبِ رسالت کی بے قدری | یہ استدلال کہ ہم صرف اول الذکر مجموعۂ احکام کی بجاآوری کے مکلف ہیں اور مابعد الذکر مجموعۂ احکام کی پابندی کے مکلف نہیں ہیں، ایسا ہی سطحی اور نتیجہ کے لحاظ سے ایسا ہی اسلام دشمن انداز ہے، جیسا کہ یہ تصور کہ قرآن مجید کے بعض عمومی اوامر و نواہی صرف

نزولِ قرآن کے وقت کے جاہل عربوں کے لئے مقصود تھے، نہ کہ بیسویں صدی کے مہذب و شائستہ انسانوں کے لئے اس استدلال کی تہہ میں منصبِ رسالت مصطفیٰ کی ایک طرح کی حیرت ناک کم قدری پوشیدہ ہے

چونکہ ایک مسلمان کی زندگی کی رہبری اسکی روحانی اور جسمانی ذوات کے مکمل اور غیر مشروط تعاون باہمی پر ہونی چاہیئے۔ اسی لئے ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی نے زندگی کو ایک ہستی مرکب، اخلاقی وعملی، انفرادی و اجتماعی مظاہر کے ایک مجموعہ کی صورت میں اپنی آغوش میں سمیٹ لیا ہے۔ سنت کے سب سے دقیق و غامض معنی یہی ہیں۔ قرآنِ پاک کا ارشاد ہے:

ما اٰتاکم الرسول فخذوہ وما نھاکم	رسول جو کچھ تمہیں دیں وہ لے لو اور جس سے
عنہ فانتھوا ۔ (سورۃ ۵۹ : ۷)	روکیں اس سے باز آجاؤ۔

اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

تفرقت الیھود علی احدی وسبعین فرقۃ	یہود اکہتر فرقوں میں بٹ گئے۔
وتفرقت النصاریٰ علی اثنین وسبعین فرقۃ	اور نصاریٰ بہتر فرقوں میں بٹ گئے۔
وستفترق امتی علی ثلاث وسبعین فرقۃ	اور میری امت تہتر فرقوں میں بٹ
(سنن ابی داؤد، جامع ترمذی، سنن دارمی مسند ابن حنبل)	جائے گی۔

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ عربی محاورہ میں ۷۰ کا عدد عموماً کثرت کے لئے بولا جاتا ہے، اور اس سے واقعتاً حسابی عدد مراد نہیں ہوتا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بظاہر یہ فرمانا چاہتے تھے کہ مسلمانوں میں یہودیوں اور نصرانیوں سے بھی زیادہ فرقے ہو جائیں گے۔ آپؐ نے فرمایا:

کلھم فی النار الا واحد ۔	صرف ایک کے سوا وہ سب کے سب جہنمی ہوں گے۔

جب صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ وہ فرقہ کون سا ہوگا۔؟ آپؐ نے فرمایا:

ما انا علیہ واصحابی ۔	وہ جو میری اور میرے اصحاب کی پیروی کریگا۔

قرآنِ مجید کی بعض آیتوں سے اس نکتہ کی ایسی وضاحت ہو جاتی ہے کہ غلط فہمی وابہام کا شائبہ تک باقی نہیں رہتا:

فلا وربک لا یؤمنون حتیٰ یحکموک	تمہارے پروردگار کی قسم یہ لوگ جب تک
فیما شجر بینھم ثم لا یجدوا فی	اپنے تنازعات میں تمہیں منصف نہ بنائیں

انفسهم حرجاً مما قضيت ويسلموا تسليما۔ (سورہ ۴ : ۶۵)

اور جو فیصلہ تم کر دو اس سے اپنے دل میں تنگ نہ ہوں بلکہ اسکو خوشی سے مان لیں تب تک مومن نہ ہوں گے۔

...

قل ان كنتم تحبون الله فاتبعونى يحببكم الله ويغفر لكم ذنوبكم والله غفور رحيم۔ قل اطيعوا الله والرسول فان تولوا فان الله لا يحب الكفرين۔ (سورہ ۳ : ۳۱ ، ۳۲)

کہہ دو کہ اگر تم خدا کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو خدا بھی تمہیں دوست رکھے گا۔ اور تمہارے گناہ معاف کر دے گا۔ اور خدا بخشنے والا مہربان ہے: کہہ دو کہ خدا اور اس کے رسول کا حکم مانو اگر نہ مانیں تو خدا بھی کافروں کو دوست نہیں رکھتا۔

...

قرآن کریم کی فہم حدیث پر موقوف ہے۔ پس قرآن مجید کے بعد کا مرتبہ سنت کا ہے جو انفرادی اور اجتماعی آداب معاشرت کے اسلامی قانون کا ماخذ ثانی ہے۔ ہم پر لازم ہے کہ سنت کو ہم قرآنی تعلیمات کی واحد مستند شرح اور ان کی عملی تعبیر و تطبیق سے متعلق نزاعات و اختلافات سے باز رہنے کا واحد ذریعہ سمجھیں۔ قرآن مجید کی بہت سی آیتیں ایسی ہیں جن کے معنی تمثیلی اور مجازی ہیں۔ اگر شرح و تفسیر کا کوئی واضح اور قطعی قاعدہ نہ ہوا ہوتا تو یہ معنی ہماری سمجھ میں آ ہی نہیں سکتے تھے۔ مزید براں عملی اہمیت کے بہت سے امور ایسے بھی ہیں جنہیں قرآن مجید میں شرح و بسط کے ساتھ بیان نہیں کیا گیا ہے۔ قرآن مجید کا انداز اس سرے سے اس سرے تک یکساں و ہموار ہے لیکن اس سے اس عملی رویہ کا استنباط کرنا جس پر ہمیں کاربند ہونا ہے۔ ہر صورت میں آسان نہیں ہے۔ جب تک ہمارا اس بات پر ایمان ہے۔ کہ قرآن مجید اللہ تبارک تعالیٰ کا کلام ہے، ہیئت و غایت کے اعتبار سے کامل و مکمل ہے، اس کا منطقی نتیجہ صرف یہی رہے گا کہ اس کتاب کا مقصود و مدعا کبھی بھی یہ نہیں رہا کہ اس پر رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصی ہدایت سے (جو نظام سنت میں مستمول ہے) بے نیاز ہو کر عمل پیرائی کی جائے۔ آئندہ باب میں قرآن مجید کو ہر زمانہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی فیض بخش و رہنما ذات اقدس کے ساتھ منسک و مربوط کرنے کے وجوہ قطعی کی تصریح کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ زیر نظر باب کے مقاصد کے لئے یہ قول کافی ہے: ہمارا استدلال یہ کہتا ہے کہ قرآنی تعلیمات کا شارع و مفسر اس شخص سے بہتر کوئی ہو ہی نہیں سکتا جس کے ذریعہ یہ تعلیمات نوع بشر تک پہنچائی گئی ہیں۔

قرآن کی طرف لوٹ جانے کا نعرہ : ہمارے زمانہ میں ہم یہ نعرہ اکثر سنا کرتے ہیں کہ ہمیں قرآن کی طرف لوٹ جانا چاہیئے لیکن سنت کی غلامانہ پیروی نہیں کرنی چاہیئے۔ یہ نعرہ اسلام سے عدم واقفیت پر دال ہے۔ جو لوگ اس قسم کی باتیں کرتے ہیں۔ ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جو ایک محل میں داخل ہونا تو چاہتا ہے لیکن وہ اصل چابی استعمال کرنا نہیں چاہتا جس کے سوا کوئی اور چابی فتح باب کے لیئے کارآمد نہیں ہو سکتی۔

اب ہم ان مآخذ کے استناد و اعتبار کے مسئلہ کی طرف رجوع کرتے ہیں جن سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ اور آپ کے ارشادات ہم پر منکشف ہوتے ہیں۔ یہ مآخذ احادیث یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال ہیں جن کی آپ کے صحابہؓ نے خبر دی اور جنہیں روایت کیا اور جو اسلام کی ابتدائی چند صدیوں کے دوران بڑی چھان بین کے بعد جمع کیئے گئے ہیں۔ بہت سے تجدد پسند مسلمان یہ اعلان کرتے پھرتے ہیں کہ وہ اتباعِ سنت کے لیئے تیار ہیں۔ لیکن وہ احادیث کے اس مجموعہ کو قابلِ اعتبار نہیں سمجھتے جس پر سنت کا دار و مدار ہے۔ احادیث کی سند اور نتیجۃً سنت کے سارے ڈھانچہ کو اصولی طور پر تسلیم نہ کرنا تو ہمارے زمانہ کا فیشن بن گیا ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا اس طرزِ عمل کی کوئی علمی سند بھی ہے؟ کیا احادیث کو شریعت اسلامی کے قابلِ اعتبار ماخذ کی حیثیت سے نہ ماننے کا کوئی علمی جواز ہے؟

شائد ہمارے دل میں یہ اندیشہ پیدا ہو کہ عقیدۂ راسخ کے مخالفین ایسے تسلی بخش دلائل و براہین پیش کر دیں جن سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب احادیث کی ساقط الاعتباری ہمیشہ کے لیئے ثابت ہو جائے۔ لیکن معاملہ یوں نہیں ہے۔ مجموعۂ احادیث کی سند کو چیلنج کرنے کے لیئے ہر قسم کے جتن استعمال کرنے کے باوجود مشرق و مغرب دونوں طرف کے جدید نقاد اپنی خالص من مانی تنقید کی تائید میں علمی تحقیق کے نتائج آج تک پیش نہیں کر سکے۔ ایسا کرنا بھی نہایت دشوار ہے، کیونکہ ابتدائی مجموعۂ احادیث کے مدوّنوں بالخصوص امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ نے ہر حدیث کی سند کی اتنی سخت جانچ پڑتال کی ہے جتنی کہ انسان کے لیئے ممکن ہو سکتی ہے۔ ——— اس سے بھی زیادہ سخت جانچ پڑتال جتنی کہ یورپی مورخین عام طور سے کسی تاریخی دستاویز کی کیا کرتے ہیں۔

محدثین نے احادیث کے اعتبار و سند کی چھان بین میں جس قدر محتاط اور متدین

طریقہ اختیار کیا تھا اس پر تفصیلی بحث کرنا اس کتاب کے اغراض و مقاصد سے باہر ہے۔ البتہ یہاں اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ اس سلسلہ میں ایک ایسا مکمل علم معرضِ وجود میں لایا گیا ہے جس کا مقصدِ وحید حدیث نبوی کے معنی، صورت اور طریقِ روایت کے بارے میں تحقیق کرنا ہے۔

علم اسماء الرجال | اس علم کی ایک شاخ نے ان تمام شخصیتوں کی تفصیلی سوانح عمریوں کا ایک متواتر سلسلہ قائم کر دیا ہے جو راویانِ حدیث کی حیثیت سے مذکور ہوئے ہیں۔ ان تمام مردوں اور عورتوں کی زندگیوں کی ہر نقطۂ نظر سے چھان پھٹک کی گئی اور صرف وہی لوگ قابلِ اعتبار تسلیم کئے گئے جن کا طریقِ زندگی اور روایتِ حدیث محدثین کے مقرر کردہ معیار پر پورا اترتا تھا، اور یہ معیار اتنا سخت تھا جتنا کہ تصور میں آسکتا ہے اس لئے آج اگر کوئی شخص کسی خاص حدیث یا پورے نظامِ حدیث کی سند پر ردّ و قدح کرنا چاہتا ہے تو اس سند کو غلط ثابت کرنے کی تمام تر ذمہ داری صرف اسی کی ذات پر عائد ہوگی۔ کسی تاریخی ماخذ کی صداقت پر ردّ و قدح کرنے کا علمی اعتبار سے اس وقت تک معمولی سا بھی جواز پیدا نہیں ہوتا جب تک کوئی یہ ثابت کرنے کے لئے تیار نہ ہوجائے کہ یہ ماخذ متناقص ہے۔ اگر خود ماخذِ حدیث کی صداقت کے خلاف یا اس کے کسی ایک یا زائد راویانِ مابعد کے خلاف کوئی معقول یعنی علمی حجت و برہان دستیاب نہ ہوسکے اور اگر دوسری طرف اس معاملہ کے بارہ میں کوئی متضاد خبر موجود نہ ہو تب تو ہم پر یہ لازم ہوجائے گا کہ اس حدیث کو صحیح تسلیم کریں۔۔۔

ایک مثال سے منکرینِ حدیث کی تردید | مثال کے طور پر فرض کیجئے کہ کوئی شخص سلطان محمود غزنوی کی ان لڑائیوں کا ذکر کرتا ہے جو ہندوستان میں لڑی گئی تھیں۔ آپ جھٹ سے کھڑے ہوکر یہ کہہ دیتے ہیں کہ: "میں تو یقین ہی نہیں کرتا کہ محمود کبھی ہندوستان آیا بھی تھا۔ یہ تو محض ایک افسانہ ہے جس کی کوئی تاریخی بنیاد ہی نہیں ہے۔" اس صورت میں کیا ہوگا؟ فوراً ہی کوئی ایسا شخص آپ کی غلطی کو درست کرنے کی کوشش کرے گا، جو تاریخ میں اچھی دستگاہ رکھتا ہو اور وہ اس حقیقت کے قطعی ثبوت میں کہ محمود واقعتاً ہندوستان میں وارد ہوا تھا، وقائع و تواریخ کے ایسے حوالے پیش کرے گا جو اس مشہور و معروف سلطان کے معاصروں کے اخبار و اطلاعات پر مبنی ہوں گے۔ اس وقت آپ کو یہ ثبوت مان لینا پڑے گا ۔۔۔ ورنہ آپکو مراقی سمجھا جائے گا جو بغیر کسی معقول وجہ کے تاریخ کے ٹھوس حقائق کا انکار کرتا ہے۔ جب

معاملہ یوں ہے تو ہر شخص کے دل میں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ ہمارے جدید نقاد مسئلہ حدیث کے بارہ میں ایسی منطق صاف باطنی کا مظاہرہ کیوں نہیں کرتے - ؟

حدیث بنیادی طور پر جھوٹی ہونے کی صورت میں اپنے مصدر اول یعنی متعلقہ صحابی یا راویانِ مابعد کیطرف سے کذب بالعمد ہوگی۔ جہاں تک صحابہ کرام کا تعلق ہے۔ اس قسم کے امکان کو سرے ہی سے ناقابلِ غور قرار دیا جا سکتا ہے۔ ابن قبیل کے مفروضات کو ظن محض کے خانہ میں پھینک دینے کے لئے مسئلہ کا نفسیاتی پہلو صرف تھوڑی سی دقتِ نظر کا متقاضی ہے۔ ان مردوں اور عورتوں پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پاکیزہ شخصیت نے جو زبردست اثر ڈالا تھا وہ تاریخ انسانیت کی ایک نمایاں حقیقت ہے۔ مزید برآں تاریخ میں بھی اس کا نہایت عمدہ دستاویزی ثبوت موجود ہے۔ کیا یہ بات وہم و گمان میں بھی آسکتی ہے۔ کہ وہ لوگ جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک اشارہ پہ اپنی جان و مال قربان کر دینے کے لئے ہمیشہ کمربستہ رہتے ہوں آپ کے اقوال وارشادات کے معاملہ میں جعل و دغل سے کام لیں گے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

من کذب علی متعمداً فلیتبوأ	جس نے میرے ساتھ عمداً کوئی جھوٹ بات
مقعدہ من النار ۔	منسوب کی وہ اپنا ٹھکانا دوزخ میں بنائے۔

(صحیح بخاری، سنن ابی داؤد، جامع ترمذی، سنن ابن ماجہ، سنن الدارمی، مسند ابن حنبل)

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی سے بخوبی واقف تھے، وہ آپ کو خدا کا کلیم سمجھتے تھے اور آپ کے کلام پہ ایمان رکھتے تھے۔ کیا نفسیاتی نقطہ نظر سے اس امر کا کوئی امکان ہو سکتا ہے کہ یہ حضرات آپ کے اس امر قطعی سے اعراض کرتے۔

ایک قانونی نقطہ سے استدلال | عدالت فوجداری کی کارروائیوں میں جج کو سب سے پہلے جس سوال سے دوچار ہونا پڑتا ہے، وہ یہ ہے کہ جرم کا ارتکاب کس کے نفع کی خاطر کیا گیا۔ قانون کے اس اصول کا اطلاق مسئلہ حدیث پر بھی کیا جا سکتا ہے۔ بہ استثنائے ان احادیث کے جن کا تعلق براہ راست بعض افراد یا گروہوں سے ہے۔ مثال کے طور پر قطعی طور پر جعلی اور وضعی احادیث جنہیں اکثر محدثوں نے مسترد کر دیا ہے۔ جو وفاتِ نبوی کے بعد پہلی صدی کی مختلف جماعتوں کے سیاسی دعاوی سے وابستہ ہیں، کسی فرد کے لئے احادیث نبوی کو گھڑنے اور وضع کرنے کی کوئی "نفع بخش" وجہ ہو ہی نہیں سکتی۔ اس صحیح اندیشہ کے مدنظر کہ شخصی اغراض کے لئے احادیث وضع کی جا سکتی ہیں، دو عظیم ترین ماہرین حدیث یعنی امام بخاری و مسلم نے

اپنی اپنی کتابوں سے وہ تمام حدیثیں چن چن کر نکال دیں جو جماعتی سیاسیات سے متعلق تھیں۔ اس کے بعد جو حدیثیں باقی رہ گئیں وہ شک وشبہ سے اس قدر بالا تھیں کہ ان سے کسی کو بھی شخصی نفع نہیں پہنچ سکتا تھا۔

صحابہؓ کی نگاہ میں حضورؐ کی زندگی | ایک استدلال اور بھی ہے جسکی بنا پر کسی حدیث کی سند کو چیلنج کیا جا سکتا ہے۔ یہ امر قابل قیاس ہے کہ یا تو اس صحابی سے جس نے حدیث کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے سنا تھا یا کسی اور راوی مابعد سے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ کو صحیح طور سمجھ نہ پانے کے باعث یا نسیان یا کسی اور نفسیاتی وجہ سے کوئی غلطی ہو گئی ہو، لیکن داخلی یعنی نفسیاتی شہادت یہ کہتی ہے کہ کم از کم صحابہ کرامؓ کی طرف سے اس قبیل کی غلطیوں کا کوئی بڑا امکان پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ شرح اس اجمال کی یہ ہے کہ جو لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے تھے ان کے نزدیک آپ کا ہر قول اور ہر فعل بے انتہا معنویت کا حامل ہوتا تھا۔ نہ صرف اس بے انتہا جذب وکشش کی بنا پر جو آپ کی پاکیزہ شخصیت سے ان کے دلوں میں پیدا ہوتی تھی بلکہ اس یقین واثق کے باعث بھی کہ اللہ تبارک تعالیٰ کی مرضی ومنشاء یہی ہے کہ وہ اپنی زندگیوں کو حتیٰ کہ زندگیوں کی جزوی تفصیلات کو بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت واسوۂ حسنہ کے مطابق منضبط کر لیں۔ اس لئے یہ لوگ آپ کے ارشادات کو سرسری طور پر نہیں سنتے تھے۔ بلکہ انہیں اپنے ذہنوں میں محفوظ رکھنے کی کوشش کرتے تھے خواہ اس سلسلہ میں انہیں کتنی ہی بڑی دشواریاں کیوں نہ پیش آتیں، کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب ترین صحابہ نے اپنے میں سے دو دو آدمیوں کی ایک ایک جماعت بنالی تھی۔ جماعت کا ایک آدمی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر رہتا تو دوسرا اپنی معیشت کی تلاش میں نکل جاتا یا کسی اور کام میں مصروف ہو جاتا۔ اپنے معلم (فداہ ابی وامی) کی زبان وحی ترجمان سے یہ حضرات جو کچھ سنتے یا آپ کے افعال میں جو کچھ دیکھتے اپنے دوسرے ساتھیوں کو اسکی خبر پہنچا دیا کرتے تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کے تعلق خاطر کا یہ حال تھا کہ وہ ڈرتے تھے کہ مبادا آپ کا کوئی قول یا فعل ان کی توجہ سے اوجھل ہو جائے۔ صحابہؓ کے اس طرز عمل کے مدنظر اس امر کا کوئی امکان نہیں پایا جاتا کہ وہ حدیث کے اصل الفاظ سے غفلت برت جاتے۔ اگر سیکڑوں صحابہؓ کے لئے یہ بات ممکن تھی کہ وہ قرآن مجید کے الفاظ کی ترتیب کو حتیٰ کہ ان کے ہجا کی معمولی سے معمولی تفصیل کو بھی ازبر کر لیا کرتے تھے تو پھر اس امر میں قطعاً کوئی شبہ نہیں

ہو سکتا کہ حضرات صحابہؓ اور ان کے تابعین کے لئے یہ بات بھی اتنی ہی ممکن تھی کہ وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے منفرد اقوال کو کسی کمی دبیشی کے بغیر اپنے ذہنوں میں محفوظ کر لیتے ہیں۔

سند کے لحاظ سے احتیاط | مزید برآں محدثین سند کامل صرف انہی حدیثوں سے منسوب کرتے ہیں۔ جو راویوں کے مختلف و جداگانہ سلسلوں سے ایک ہی شکل و صورت میں بیان کی گئی ہو۔ کیا یہ سب کچھ صداقت حدیث کے لئے کافی نہیں ہے؟ کسی حدیث کے صحیح ہونے کے لئے یہ ضروری قرار دیا گیا ہے کہ روایت کے ہر مرحلہ پر کم از کم دو راویوں کی آزاد شہادت سے اسکی تصدیق ہو تاکہ کسی مرحلہ پہ بھی روایت کسی ایک ہی شخص کی سند پہ مبنی نہ ہونے پائے۔ تصدیق کا یہ لزوم اس قدر سخت ہے کہ ایک ہی حدیث، جو مثال کے طور پہ صحابی اور مدوّن کے مابین راویوں کی تین "پشتوں" میں بیان ہوتی چلی آئی ہو، اس کے راویوں کی تعداد بیس یا اس سے بھی زائد ہو جاتی ہے۔

نقادان یورپ کی سادہ لوحی | بایں ہمہ کسی مسلمان کا یہ ایمان کبھی بھی نہیں رہا کہ احادیث کا مرتبہ قرآن مجید کے برابر ہے یا ان کی سند قرآن مجید کی طرح مسلم ہے۔ احادیث کی ناقدانہ چھان بین کا سلسلہ کسی زمانہ میں بھی بند نہیں ہوا۔ یہ حقیقت کہ بے شمار حدیثیں وضعی ہیں۔ محدثوں کی توجہ سے ذرہ برابر بھی اوجھل نہیں ہونے پائی، جیسا کہ نقادان یورپ سادہ لوحی سے اس کے برعکس فرض کرتے نظر آتے ہیں۔ اس کے برخلاف حدیث کے تنقیدی علم کی ابتداء ہی اسی ضرورت کے مدنظر ہوئی کہ مستند اور وضعی حدیثوں کے مابین تمیز کی جائے۔ خود امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ جیسے جلیل القدر محدثین اسی تنقیدی انداز کی راست پیداوار تھے۔ لہذا جھوٹی حدیثوں کے وجود سے پورے نظام حدیث کے خلاف قطعاً کوئی بات ثابت نہیں ہو سکتی۔ — ان جھوٹی حدیثوں کا معاملہ الف لیلہ کے کسی خیالی افسانہ سے زیادہ نہیں ہے جس کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ وہ کسی ہم عصر تاریخی اطلاع کی سند و اعتبار کے خلاف کوئی دلیل بن سکتا ہے۔

حدیث سے معاندانہ رویہ کا محرک کیا ہے | آج تک کوئی نقاد با اصول طریقہ سے یہ ثابت ہی نہ کر سکا کہ احادیث کا کوئی مجموعہ جسے قدماء محدثین کے قائم کردہ معیار کے مطابق مستند سمجھا جاتا ہے، وہ جھوٹا ہے۔ مستند احادیث کا جزوی یا کلی رد محض ایک مزاجی معاملہ ہے جسے غیر جانبدارانہ عالمانہ تحقیق کا پایۂ ثبوت آج تک نصیب ہی نہ ہو سکا۔ لیکن ہمارے زمانہ کے بعض مسلمانوں نے جو اس قسم کا مخالفانہ رویہ اختیار کر رکھا ہے۔ اس کے محرک کا کھوج لگانا

تو بہت آسان ہے۔ یہ محرک ہماری اس بے بسی اور بے بضاعتی میں پوشیدہ ہے۔ کہ ہم اپنی فکر و حیات کے موجودہ خوار و زبوں طریقوں کو اسلام کی اس سچی روح کے ہم آہنگ نہیں بنا سکتے جو سنت نبوی میں تجلی ریز ہے۔ خود اپنی اور اپنے ماحول کی خامیوں کے جواز کو ثابت کرنے کے لئے حدیث کے یہ ادعائی نقاد اتباع سنت کے لزوم ہی کو موقوف کر دینے کی کوشش کرتے ہیں کیوں کہ اگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو پھر انہیں قرآنی تعلیمات کی سطحی عقلیت کے خطوط پر من مانی تاویل و تعبیر کرنے کا موقع ہاتھ آجائے گا اور اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ ایک اخلاقی اور عملی، ایک انفرادی اور اجتماعی ضابطۂ حیات کی حیثیت سے اسلام کو جو استثنائی موقف حاصل ہے اس کے پرخچے اڑ جائیں گے۔

فتنۂ انکارِ حدیث کی بنیاد مغرب زدگی ہے۔ اس زمانہ میں جبکہ مسلم ملکوں میں مغربی تہذیب کا اثر روز بروز شدید تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ ہمیں حدیث و سنت کے معاملہ میں نام نہاد مسلم دانشوروں کے عجیب و غریب رویہ میں ایک محرک اور نظر آتا ہے۔ سنت نبوی کی اتباع کے ساتھ ساتھ مغربی طریق حیات کی تقلید کرنا قطعاً ناممکن ہے۔ لیکن مسلمانوں کی موجودہ نسل کا حال یہ ہے کہ وہ ہر چیز کی بندگی کے لئے تیار ہے۔ جس پر مغرب کی چھاپ لگی ہوتی ہے۔ نیز وہ اجنبی تہذیب کی پرستش کے لئے بھی اس وجہ سے کمربستہ ہے کہ وہ اجنبی ہے، طاقتور ہے اور مادی اعتبار سے درخشندہ و تاباں ہے۔ آج احادیث نبوی اور ان کے ساتھ سنت کا پورا ڈھانچہ جو اس قدر غیر ہر دلعزیز اور نامقبول بن گئے ہیں اس کی سب سے زبردست وجہ یہی "مغرب زدگی" ہے۔ سنت ان بنیادی تصورات کی بدیہی طور پر مخالف ہے جو مغربی تہذیب کی تہ میں پائے جاتے ہیں۔ ان لوگوں کو جو مغربی تہذیب کے شیدائی ہیں۔ اس الجھن سے فرار کی اس کے سوا اور کوئی راہ نظر نہیں آتی کہ وہ کہہ اٹھتے ہیں کہ سنت محض ایک بے محل اور غیر متعلق چیز ہے۔ لہٰذا یہ اسلام کا کوئی لازمی پہلو نہیں ہے۔ اس کے بعد قرآنی تعلیمات کی قبا پر اس طور سے قینچی چلانا بہت آسان ہو جاتا ہے۔ کہ وہ مغربی تہذیب کی روح پر چسپت ہو جائے ۔۔۔۔۔۔

جائزہ اور محاسبہ
قسط دوم

حضرت مولانا محمد یوسف صاحب زماموں کانجن)
جامعہ رشیدیہ ساہیوال

گذشتہ سے پیوستہ

ان تمام احادیث کا مضمون مشترک ہے، مگر ہر حدیث کسی نئے افادے پر مشتمل ہے۔ اس لئے سب کا سامنے رکھنا ضروری ہے، ان احادیث سے حسب ذیل امور ادنیٰ نظر میں واضح طور پر مستفاد ہوتے ہیں۔

۱۔ اسلامی احکام میں قمری مہینوں اور سالوں کا اعتبار ہوگا۔

۲۔ قمری مہینہ کبھی انتیس کا ہوتا ہے، کبھی تیس کا۔

۳۔ رویت ہلال میں سر کی آنکھوں سے چاند دیکھنے کا مفہوم قطعی طور پر متعین ہے۔ ان احادیث میں کسی دوسرے معنیٰ کے احتمال کی گنجائش نہیں۔[۱]

۴۔ قمری مہینوں کی تبدیلی کا مدار چاند نظر آنے یا تیس دن پورے ہونے پر ہے۔ اگر انتیس

---

[۱] بدایۃ المجتہد: لابن رشد القرطبیؒ: فان العلماء اجمعوا ان الشہر العربی یکون تسعاً وعشرین ویکون ثلاثین، وعلی ان الاعتبار فی تحدید شہر رمضان انما ھو الرؤیۃ، لقولہ علیہ الصلوٰۃ والسلام "صوموا لرؤیتہ وافطروا لرؤیتہ" یعنی بالرؤیۃ اول ظہور القمر بعد السرار (ص۲۸۴)

کا چاند نظر آجائے تو نیا مہینہ شروع ہو جائے گا۔ ورنہ سابقہ ماہ کے تیس دن شمار کرنا لازم ہوں گے[1]

۵۔ اگر افق پر ابر، غبار، سیاہی یا اور کوئی چیز مانع رؤیت نہ ہو تو انتیس کے چاند کا ثبوت "رؤیت عامہ" سے ہوگا، جب پورے علاقہ یا ملک کے لوگ چاند دیکھنے میں کوشاں ہوں، اور اس کے باوجود عام رؤیت نہ ہو سکے، تو علاقے اور ملک کے صرف دو چار افراد کے دعویٰ سے "رؤیت" کا ثبوت نہیں ہوگا۔ چنانچہ ان احادیث طیبہ میں انفرادی شہادت قبول کرنے کا حکم مطلع ابر آلود ہونے کی صورت میں دیا گیا ہے، اور مطلع صاف ہونے کی صورت میں انفرادی شہادت کی بجائے اذا رایتم (جب تم دیکھ لو) فرما کر "رؤیت عامہ" پر ثبوت ہلال کا مدار رکھا گیا ہے، اور عقلاً بھی یہ بات بدیہی ہے کہ جب مطلع صاف ہو، سب لوگ سراپا اشتیاق بن کر افق پر ٹکٹکی باندھے ہوئے ہوں، اور کوئی چیز مانع رؤیت نہ ہو، اس کے باوجود رؤیت عامہ نہ ہو سکے، تو ایسی صورت ایک دو افراد کا یہ دعویٰ کہ "ہم نے چاند دیکھا ہے" پوری قوم کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے مرادف ہے، ظاہر ہے کہ پوری قوم کو اندھا یا ضعیف البصر قرار نہیں دیا جا سکتا ہے، بلکہ اسکی بجائے اس افرادی بیان ہی کو غلط ماننا ہوگا۔ بالخصوص جب کہ بلند و بالا چوٹیوں پر دوربینوں کی مدد سے بھی چاند نظر نہ آئے تو ان لوگوں کی غلطی یا غلط بیانی اور بھی واضح ہو جائے گی۔[2]

۶۔ مطلع غبار آلود ہو تو جیسا کہ احادیث بالا میں تصریح ہے، ہلال عید کا ثبوت کم از کم معتبر

---

[1] احکام القرآن: ابوبکر جصاص رازی: وقوله صلی الله علیه وسلم: صوموا لرؤیته وافطروا لرؤیته فان غم علیکم فاکملوا العدة ثلاثین۔ هو اصل فی اعتبار الشهر ثلاثین الا ان یریٰ قبل ذالک الهلال، فان کل شهر غم علینا هلاله فعلینا ان نعدّه ثلاثین، هذا فی سائر الشهور التی تتعلق بها الاحکام، وانما یصیر الی اقل من ثلاثین برؤیة الهلال۔ (صفحہ ۲۰۲ ج ۱)

[2] احکام القرآن: ابوبکر جصاص رازی: قال ابوبکر: انما اعتبر اصحابنا اذا لم یکن بالسماء علة شهادة الجمع الکثیر الذین یقع العلم بخبرهم: لان ذالک فرض قد عمت الحاجة الیه، والناس مامورون بطلب الهلال فغیر جائز ان یطلبه الجمع الکثیر ولا علة بالسماء مع توافی هممهم وحرصهم علی رؤیته ثم یراه النفر الیسیر منهم دون کافتهم علمنا انهم غالطون غیر مصیبین، فاما ان یکونوا راوا خیالا فظنوه هلالا او تعمدوا الکذب وجواز ذالک غیر ممتنع، وهذا اصل صحیح تقتضی العقول بصحته، وعلیه مبنی امر الشریعة والخطاء فیه یعظم ضرره ویتوصل الملحدون الی ادخال الشبهة علی الاغمار والحشو وعلی من لم یتیقن ما ذکرنا من الاصل (صفحہ ۲۰۲ طبع ۱۳۳۵ھ)

عادل اور دیانت دار گواہوں کی چشم دید[۱] شہادت سے ہوگا، صرف ایک شخص کی شہادت[۲] یا محض

---

۱ اور موطن (شاہدوں) کی گواہی دو معتبر اشخاص کی گواہی، جسے "شہادت علی الشہادت" کہا جاتا ہے اسی قاضی کے فیصلہ پر دو عادلوں کی گواہی (شہادت علی قضاء القاضی) کا حکم بھی یہی ہے، کیونکہ یہ دونوں بھی "حجت ملزمہ" ہیں، کما صرح بہ القوم۔

۲ جو حضرات اختلاف مطالع کے قائل نہیں (اور ہمارے فاضل مؤلف ان ہی کے مؤید ہیں) ان کے نزدیک مندرجہ ذیل کا محل بھی یہی ہے۔

عن كريب ان ام الفضل بنت الحارث بعثته الى معاوية بالشام: قال: فقدمت الشام، فقضيت حاجتها واستهل رمضان وانا بالشام فرأينا الهلال ليلة الجمعة، ثم قدمت المدينة في آخر الشهر فسألني ابن عباس ثم ذكر الهلال فقال: متى رأيتم الهلال؟ فقلت: رأيناه ليلة الجمعة فقال: انت رأيته ليلة الجمعة؟ فقلت: رآه الناس وصاموا وصام معاوية: فقال: لكن رأيناه ليلة السبت، فلا نزال نصوم حتى نكمل ثلاثين يوماً او نراه، فقلت: الا تكتفي برؤية معاوية وصيامه؟ قال: لا، هكذا امرنا رسول الله صلى الله عليه وسلم (ابوداؤد ص ۳۱۹ ترمذی ص)

حضرت کریب فرماتے ہیں: ام الفضلؓ بنت حارث (والدہ ابن عباسؓ) نے انہیں حضرت معاویہؓ کے پاس شام میں بھیجا، میں شام پہنچا اور اپنے کام سے فارغ ہوا، تو رمضان کا چاند مجھے شام ہی میں ہوا، چنانچہ ہم نے جمعہ کی رات کو چاند دیکھا، پھر رمضان مبارک کے آخر میں مدینہ طیبہ واپس آیا، حضرت ابن عباسؓ نے مجھ سے حالات دریافت کئے، پھر چاند کا ذکر آیا تو دریافت فرمایا: تم نے چاند کب دیکھا تھا؟ میں نے کہا: ہم نے جمعہ کی رات کو دیکھا، فرمایا: تو نے جمعہ کی رات کو خود دیکھا تھا، میں نے کہا: لوگوں نے چاند دیکھ کر روزہ رکھا اور حضرت معاویہؓ نے بھی روزہ رکھا۔ فرمایا: لیکن ہم نے سنیچر کی رات کو دیکھا ہے۔ اس لئے ہم تو اپنے حساب سے تیس روزے پورے کریں گے، الا یہ کہ خود انتیس کا چاند دیکھ لیں۔ میں نے کہا کیا آپ حضرت معاویہؓ کی رؤیت اور روزہ رکھنے (کے فیصلہ) کو کافی نہیں سمجھتے، فرمایا: نہیں! (کیونکہ ہمیں وہاں کی رؤیت کا ثبوت دو ثقہ گواہوں کی شہادت سے نہیں ملا، صرف تمہاری ایک آدمی کی اطلاع ہمارے افطار کیلئے حجت نہیں) ہمیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طرح حکم فرمایا ہے۔

افواہی خبروں کا اعتبار نہ ہوگا۔ (اور مطلع غبار آلود ہونے کی صورت میں ہلال رمضان کیلئے، دوسری احادیث کے مطابق، صرف ایک مسلمان عادل یا مستور الحال کی خبر بھی کافی ہوگی۔)

۷۔ ان احادیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ارشاد فرمودہ ہدایات پر نظر ڈالئے تو واضح ہوگا کہ آپؐ نے ثبوت ہلال کیلئے ایک قطعی اصول اور ضابطہ مقرر فرمایا، یعنی انتیس کو مطلع صاف ہونے

ــــ اور جن حضرات کے نزدیک مطالع کا اختلاف معتبر ہے، وہ اسکی توجیہ یہ کریں گے، کہ چونکہ ہر علاقہ کا مطلع الگ ہے۔ اس لئے ایک مطلع کی رؤیت دوسرے علاقے والوں کے لئے کافی نہیں، خواہ اس کا ثبوت صحیح شہادت سے بھی ہو جائے۔

لہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما قال: جاء اعرابی الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال انی رأیت الہلال یعنی ہلال رمضان، قال: أتشہد ان لا الٰہ الا اللہ، قال: نعم، قال: أتشہد ان محمد الرسول اللہ قال نعم یا بلال اذن فی الناس ان یصوموا غداً (رواہ ابوداؤد، والترمذی، والنسائی وابن ماجۃ والدارمی)

ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک دیہاتی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا اور کہا میں نے رمضان کا چاند دیکھا ہے (عام رؤیت نہیں ہوئی تھی) آپؐ نے فرمایا: کیا تم اللہ کی توحید کے قائل ہو، اس نے کہا: جی ہاں، فرمایا: کیا تم میری رسالت کو مانتے ہو، اس نے کہا: جی ہاں، فرمایا: بلال! لوگوں میں اعلان کر دو کہ کل روزہ رکھیں۔

وعن ابن عمر رضی اللہ عنہما قال: ترآء الناس الہلال، فاخبرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انی رأیتہ، فصام، وامر الناس بصیامہ (رواہ ابوداؤد والدارمی والروایتان فی المشکوٰۃ ص۱۷۴)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: لوگ چاند دیکھ رہے تھے۔ (مگر ابر کی وجہ سے عام لوگوں کو نظر نہیں آیا) میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دی کہ میں نے دیکھ لیا ہے، آپؐ نے میری خبر پر خود بھی روزہ رکھا اور لوگوں کو روزہ رکھنے کا حکم دیا۔

کی صورت میں رؤیت عامہ کا اعتبار ہو گا۔ اور مطلع کے غبار آلود ہونے کی صورت میں شہادت کا اعتبار کیا جائے گا۔ اور دونوں مفقود ہوں تو تیس دن پورے کئے جائیں گے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خود اپنا عمل اسی ضابطے پر تھا، صحابہ و تابعین رضوان اللہ علیہم اجمعین اسی اصول کے پابند تھے۔ اور امت مسلمہ کو اسی قاعدے کی پابندی کا بار بار تاکیدی حکم فرمایا —— اور الحمدللہ امت مسلمہ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے بموجب اس کا خوب التزام بھی کیا —— لیکن کسی حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ادنیٰ سے ادنیٰ اور ہلکے سے ہلکا اشارہ اسطرف نہیں فرمایا: کہ اس اصول کو چھوڑ کر امت کسی مرحلے میں، کسی دوسرے طریقہ پر بھی اعتماد کر سکتی ہے۔ کسی حسابی فن سے بھی اس سلسلہ میں مدد لے سکتی ہے۔ یا روزہ و افطار کے اوقات متعین کرنے کے لئے کسی دوسرے اصول کی طرف بھی رجوع کر سکتی ہے۔ اب اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وضع فرمودہ اصول رؤیت کو چھوڑ کر کسی فن پر اعتماد کرنے اور اس کے ماہرین کیطرف رجوع کرنے سے بھی منشائے نبوت پورا ہو سکتا تھا۔ جیساکہ فاضل مؤلف اسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سر تھوپنا چاہتے ہیں[1] تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے ہمیں اس کا کوئی معمولی اشارہ تو ملنا چاہئے تھا، یا کم از کم صحابہ و تابعین اور ائمہ ہدیٰ کیطرف سے اس اصول نبوی سے ہٹ کر کسی دوسری راہ کو اختیار کرنے کی گنجائش کا کہیں سراغ ملتا۔

لیکن اس کے برعکس ہم یہ دیکھتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کہیں تو لا نکتب ولا نحسب (ہم حساب کتاب نہیں کیا کرتے) کہہ کر اوقات کی تعیین کے باب میں حسابی تخمینوں کی حوصلہ شکنی فرمائی،

---

[1] دور حاضر کی کم سوادی اور ستم ظریفی کا ایک مظہر یہ بھی ہے، کہ جو چیز اپنے ذہن عالی میں آئے اسے کھینچ تان کر بڑوں کیطرف منسوب کرو، اور جو چیز بڑوں سے صراحۃً ثابت ہو، اس سے صاف مکر جاؤ، اور اگر اس طرح نہ بن آتی ہو تو اسے تاویل کے خراد پر چڑھاؤ۔ "خاندانی منصوبہ بندی سے لیکر سوشلزم تک جو بات کسی کے ذہن نے اچھی سمجھی، فٹ سے اسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیطرف منسوب کر ڈالا۔ صحابہ کرامؓ کا حال یہ تھا، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جو ارشادات انہوں نے ایک دو بار نہیں، بیسیوں بار اپنے کانوں سے سنے ہوتے تھے۔ ان کی روایت میں بھی حد درجہ محتاط تھے، مگر ہمارے یہاں اپنے ذہنی وساوس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب کرنا ضروری سمجھا جاتا ہے۔

کہیں دونوں ہاتھوں کے اشارے سے الشھر ھکذا وھکذا (مہینہ اتنا اتنا اور اتنا ہوتا ہے) مگر سن وسال کے سلسلہ میں حساب پر بالکلیہ بے اعتمادی کا اظہار فرمایا۔ (ورنہ ظاہر ہے کہ اس مضمون کو سمجھانے کیلئے کہ مہینہ کبھی ۲۹ کا ہوتا ہے کبھی ۳۰ کا، دونوں ہاتھوں کو چھ دفعہ اٹھانے اور ھکذا کا لفظ چھ دفعہ دہرانے کی بنسبت ۲۹-۳۰ کا عدد مختصر بھی تھا اور واضح بھی۔ اور آپ کے مخاطب ان دو ہندسوں سے ناآشنا بھی نہیں تھے۔)[1] کہیں فلا تصوموا حتیٰ تروہ ولا تفطروا حتیٰ تروہ (روزہ نہ رکھو جب تک چاند نہ دیکھ لو۔ اور افطار نہ کرو جب تک چاند نہ دیکھ لو۔) فرماکر رؤیت کے بغیر کسی نوع کے حسابی تخمینہ پر اعتماد کرتے ہوئے، روزہ وافطار کرنے سے امت کو صاف صاف منع فرمایا۔ اور کہیں چاند دیکھ کر "دوسری تاریخ کا ہے" کا نعرہ لگانے کو قرب قیامت کی علامت بتلاکر، حسابی طریقوں پر اعتماد سے نفرت دلائی، اور اسے ذہنی انحطاط اور دینی تنزل کا مظہر قرار دیا۔[2] کہیں بلا استثناء اہل نجوم کی تصدیق کو "کفر" سے تعبیر فرمایا، مگر کسی موقعہ پر بھی یہ تصریح نہیں فرمائی کہ اہل نجوم کی تقویم پر اعتماد کرتے ہوئے بھی چاند کا فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔[3]

---

[1] اکمال اکمال المعلم (شرح صحیح مسلم): لابی عبد اللہ محمد بن خلفہ الوشتانی الابیّ المالکی (م ۸۲۰) وفی احادیث الاشارۃ ھذہ الارشاد الی تقریب الاشیاء بالتمثیل وھو الذی قصدہ صلی اللہ علیہ وسلم ولم یصنع ذالک لاجل ما وصفہم بہ من الامیۃ لا یحسبون ولا یکتبون، لانہم لا یجھلون الثلاثین والتسع والعشرین، مع ان التعبیر عنھما اخف من الاشارۃ المکررۃ وانما وصفہم بذلک سد ابواب الاعتداد بحساب المنجمین الذی تعتمدہ العجم فی صومہا وفطرہا وفصولہا (ص ۲۲۳ طبع مصر ۱۳۲۸ھ)

[2] عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم: من اقتراب الساعۃ ان یری الھلال قبلا فیقال للیلتین وان تتخذ المساجد طرقا، وان یظہر موت الفجاءۃ (رواہ الطبرانی فی الاوسط کما فی الکنز ص ۱۷۶)

حضرت ابن مسعود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ: من جملہ قرب قیامت کی علامات کے یہ ہے کہ چاند کو سامنے دیکھ کر کہا جائے گا، یہ تو دوسری رات کا ہے۔ اور مساجد کو گذرگاہ بنالیا جائے گا اور اچانک موتیں عام ہوں گی۔

[3] المنہل العذب المورود شرح سنن الامام ابی داؤد: للشیخ محمود محمد خطاب السبکی

ادہر قرآن حکیم نے شرعی اصول اوقات کو چھوڑ کر کسی خود ساختہ اصطلاح سے ماہ و سال ادل بدل کو جو جاہلیت اولی کا شعار تھا، زیادۃ فی الکفر اور زینۂ گمراہی قرار دیا[1] ان تمام امور کو سامنے رکھ کر ہر شخص جس کی چشم انصاف بند نہ ہو گئی ہو، آسانی سے فیصلہ کر سکتا ہے کہ ثبوت ہلال کے شرعی اصول اور نبوی ضابطہ کو چھوڑ کر صرف جنتری کے بھروسے روزہ و افطار کرنا مزاج نبوت[2] سے کہاں تک میل کھاتا ہے۔ منشاء شریعت کو کہاں تک پورا کرتا ہے۔ اور فاضل مؤلف کے بقول اسے "رؤیت کی ترقی یافتہ تعبیر" کہنا اور اس بدعت کو حفاظت ایمان کا ذریعہ بتلا کر اسکی پرچار کرنا کہاں تک بجا ہے۔

ان احادیث میں صحابہ و تابعین (رضی اللہ عنہم اجمعین) کے طرز عمل کی وضاحت موجود ہے۔ کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قائم کردہ "اصول رؤیت" پر سختی سے کاربند تھے۔ اور وہ

وحسبك فى ابطال العمل بالحساب والتنجيم قوله تعالى: "قل لا يعلم من فى السموات والارض الغيب الا الله"، وقوله: صلى الله عليه وعلى آله وسلم. "من اتى عرافاً او كاهناً فصدقه بما يقول، فقد كفر بما انزل على محمد صلى الله عليه وعلى آله وسلم" - (احمد والحاكم) ومن احاديث المصابيح: من اقتبس علماً من النجوم اقتبس شعبة من السحر. (ص ۳۴/۱)

[1] (التوبہ: آیت ۳۷)

[2] شرح ترمذی: لابن العربی — اوّه يا ابن شريح، ابن مسائلك الشرعية، واين صوارمك السريجية، تسلك هذا المضيق فى غير الطريق، وتخرج الى الجهل عن العلم والتحقيق، ما للعمل والنجوم ...؟ ... وكانك لم تقرأ قوله: "انا نحن امة امية لا نحسب ولا نكتب، الشهر هكذا وهكذا" واشار بيديه الكريمتين ثلاث اشارات وخنس بابهامه فى الثالثة. فاذن كان يتبرأ من الحساب الاقل بالعقد المصطلح عليه مبيناً باليدين تنبيهاً على عن الاكثر منه، فما ظنك بمن يدعى عليه بعد ذالك ان يحيل على حساب النيرين، وينزلها على درجات فى افلاك غائباً ويقربهما باجتماع واستقبال حتى يعلم بذالك استهلال۔ (ص ۲۰۱)

بار بار خطبوں میں، خطوط میں اور نجی مجلسوں میں عہد الینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم — ھکذا امرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہہ کر امت کو اسی اصول پہ کاربند رہنے کی تلقین فرماتے تھے۔ چنانچہ پورا ذخیرۂ حدیث وسیر چھان جائیے، مگر آپ کو کسی صحابی کے بارے میں یہ نہیں ملے گا کہ انہوں نے اس اصول رؤیت کو چھوڑ کر کسی حسابی تخمینے پہ اعتماد کرنے کا فتویٰ دیا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ باتفاق امت، شریعت اسلامیہ نے ثبوت ہلال کے باب میں اہل حساب و فلکیات کی رائے کا اعتبار نہیں کیا، بلکہ ان کی تحقیق کو سرے سے کالعدم اور لغو قرار دیا ہے، مثلاً فلکیات کی رائے ہو کہ فلاں تاریخ کو چاند ہو گا، لیکن رؤیت شرعیہ نہ ہو سکے تو باجماع امت نئے چاند کے احکام جاری نہیں ہوں گے۔ اس کے برعکس فلکیات کے مطابق فلاں تاریخ کو چاند کے امکانات نہ ہوں، لیکن رؤیت شرعیہ متحقق ہو جائے تو باجماع امت اس رؤیت پر احکام ہلال جاری ہوں گے۔ اور فلکیات کی رائے لغو ہو گی، [1]

رہا یہ سوال کہ شریعت نے احکام ہلال کا مدار رؤیت پر کیوں رکھا، فلکیاتی تحقیقات پر کیوں نہیں رکھا، ہمارے نزدیک یہ سوال ہی بے محل ہے، بحیثیت مسلمان ہمارا کام یہ ہے کہ ہم اچھی طرح یہ تحقیق کریں کہ فلاں باب میں شارع نے کیا حکم دیا ہے۔؟ یہ معلوم ہو جانے کے بعد ہمیں شارع سے یہ پوچھنے کا حق نہیں کہ یہ حکم آپ نے کیوں دیا ہے۔؟ کیونکہ ہمارے مسلمان ہونے کا پہلا نتیجہ اس بات کا قطعی یقین ہے کہ شارع کی طرف سے جو حکم بھی دیا جاتا ہے، اس سے خود شارع کی کوئی غرض وابستہ نہیں، بلکہ وہ سراسر بندوں ہی کی مصلحت کے پیش نظر

---

[1] فتح الباری، عسقلانی ص ۹۰/۴، عمدۃ القاری للعینی ص ۱۸۲/۵ و ص ۱۹۹/۵۔ زرقانی علی المؤطا ص ۱۵۴/۲، رد المحتار لابن عابدین الشامی ص ۱۰۰/۲ و ص ۱۰۴، احکام القرآن للجصاص وغیرہ وغیرہ یہاں سب کا نام دینا بھی ممکن نہیں، چہ جائیکہ ان کی تصریحات بھی نقل کی جائیں، البتہ امام جصاص رازی کی تصریح تو سن ہی لیجئے۔

فالقول باعتبار منازل القمر وحساب المنجمين خارج عن حكم الشريعة وليس هذا القول مما يسوغ الاجتهاد فيه، لدلالة الكتاب والسنة واجماع الفقهاء بخلافه (ص ۲۰۲/۱)

منازل قمر اور فلکیات کے حساب پر اعتماد کرنا حکم شریعت سے خارج ہے، اور یہ ایسی چیز نہیں جس میں اجتہاد کی گنجائش ہو، کیونکہ کتاب اللہ، سنت نبویہ اور اجماع فقہاء کے دلائل اس کے خلاف ہیں۔

دیا گیا ہے۔ کبھی اس مصلحت کا اظہار مناسب ہوتا ہے کبھی نہیں ہوتا، لیکن وہ مصلحت بہرحال اس حکم پر مرتب ہوگی، خواہ بندوں کو اس کا علم ہو یا نہ ہو، اس لئے وہ خود کسی مصلحت کا اظہار فرمادیں تو ان کی غایت عنایت ہے، ورنہ بندے کو یہ حق کب حاصل ہے۔؟ کہ وہ اس بات پر اصرار کرے کہ پہلے اس حکم کی مصلحت بتلائیے تب مانوں گا، اور آپ جانتے ہیں کہ اگر کوئی مصلحت بتلانے کی ہو تب بھی اس ذہنیت کے شخص کو تو کبھی نہیں بتلائی جاسکتی۔

بہرحال ہمیں یہ تحقیق کرنے کا حق ہے۔ کہ شریعت نے ہلال کا مدار فلکیات پر رکھا ہے۔ یا نہیں، اور اسے کسی درجہ میں قابلِ اعتبار قرار دیا ہے، یا بالکلیہ ناقابلِ اعتماد۔ لیکن یہ سوال ہم نہیں کر سکتے کہ شریعت نے ہلال کا مدار رؤیت پر کیوں رکھا اور فلکیات وغیرہ پر کیوں نہیں رکھا۔؟۔ ہوسکتا ہے کہ اس میں شارع کے پیشِ نظر بندوں کی بہت سی مصلحتیں ہوں، اور وہ صرف رؤیت پر مرتب ہوسکتی ہوں اور فلکیات نہیں۔ مثلاً دوسری قوموں کے مہ و سال کا مدار تقویمی حسابوں پر تھا، شارع نے اس امت کی انفرادیت کو محفوظ رکھنے کیلئے جس طرح اور بہت سی چیزوں کو ان کی مشابہت سے امت کو بچانا چاہا، اور ان کو ایک مستقل نظام تقویم دیا[1]۔ یا ہو سکتا ہے، کہ چونکہ دوسرے حسابی طریقوں سے ماہ و سال کی تعین فطری اور تحقیقی نہیں تھی بلکہ اختراعی اور تقریبی تھی، چنانچہ انہیں اس کمی بیشی کو برابر کرنے کیلئے "لیپ" کی اصطلاح ایجاد کرنا پڑی، اس کے برعکس اسلام دینِ فطرت تھا، اس نے چاہا کہ امتِ اسلامیہ کے ماہ و سال کی تعیین کیلئے "رویت" اور مشاہدہ کا فطری طریقہ مقرر کیا جائے، کیونکہ یہ اختراعی اور تقریبی طریقے اسکی فطرت سے میل نہیں کھاتے تھے، یا ممکن ہے اس امر کی رعایت رکھی گئی ہو کہ چونکہ اسلام کے پورے نظام کی بنیاد تکلف اور تعمق پر نہیں بلکہ سادگی اور سہولت پر رکھی گئی ہے۔ اس لئے "اسلام کے نظامِ تقویم" کو بھی مشاہدہ اور رؤیت جیسے آسان اور سادہ اصول پر مبنی کیا گیا تاکہ "جزو کل" میں مناسبت رہے، اور اس باب میں امت تکلف[2] اور

---

[1] من أسباب الاعتداد بحساب المنجمين الذی تعتمدہ العجم فی صومها وفطرها وفصولها ــــ (اکمال اکمال المعلم شرح مسلم للابی ص۲۳)

[2] اقول لما کان تعلقت الصوم منضبطاً بالشهر القمری باعتبار رؤیة الهلال وهو تارة ثلاثون یوماً وتارة تسع وعشرون وجب فی صورة الاشتباه ان یرجع الی هذا الاصل وایضاً مبنی الشرائع علی الامور الظاهرة عند الامیین دون التعمق والمحاسبات النجومیة بل الشریعة واردة باخمال ذکرها وهو قوله صلی الله علیه وسلم لا نکتب ولا نحسب۔ (حجة الله ص۵۱ ج۲)

شفقت میں مبتلا نہ ہو جائے، یا ممکن ہے کہ اس چیز کا لحاظ رکھا گیا ہو، کہ نظام تقویم بہر حال اوقات کی تعیین کا ایک ذریعہ ہے۔ اور جو قوم ذرائع میں منہمک ہو کر رہ جاتی اکثر و بیشتر مقاصد اسکی نظر سے اوجھل ہو جاتے ہیں، اور فطری طور پر ان کی صلاحیتیں ذرائع ہی کھپ کر ضائع ہو جاتی ہیں۔ اس لئے چاہا گیا کہ امت مسلمہ کو نظام تقویم ایسا دیا جائے جس میں منہمک ہو کر مقصدی صلاحیتیں کھو بیٹھنے کا ذرا بھی اندیشہ نہ ہو، بس آنکھ کھولی، چاند دیکھ لیا، تقویم درست ہو گئی، اور سب اپنے اپنے کام میں لگ گئے۔ نہ ضرب کی ضرورت نہ تقسیم کی، نہ محکمہ موسمیات قائم کرنے کی ضرورت نہ اس پر ریسرچ کی۔ یا ممکن ہے یہ امر پیش نظر ہو کہ اس امت میں امیر بھی ہوں گے، غریب بھی، عالم بھی جاہل بھی، مرد بھی اور عورتیں بھی، اور بیشتر عبادات و معاملات کا مدار نظام تقویم پر ہے۔ اس لئے چاہا گیا کہ جسطرح نظام تقویم سے متعلقہ احکام کے مکلف کے امت کے سبھی طبقات ہیں، اسی طرح ان کو نظام تقویم بھی ایسا دیا جائے جس پر ہر شخص اپنے مشاہدے کی روشنی میں پورے شرح صدر کے ساتھ یقین کر سکتے۔ یا ممکن ہے کہ شارع کو جو یقین ہلال کے باب میں مطلوب ہے وہ رؤیت اور مشاہدے پر ہی مرتب ہو سکتا ہو۔ اسکی نظر ؟ اس یقین کے پیدا کرنے میں ناکافی ہو۔ یا ہو سکتا ہے کہ شارع نے اس امر کو پسند نہ فرمایا ہو کہ روزہ افطار تو سب کریں، مگر ان کے اوقات کی تعیین ایک خاص گروہ کے رحم و کرم پر ہو؛ اس لئے نظام تقویم ایسا مقرر فرمایا کہ ایک عامی بھی اپنے وقت کی تعیین ٹھیک اسی طرح کر سکتا ہے، جسطرح ایک ماہر فلکیات اور ایک بدوی بھی اسی طرح اپنے اوقات کا حساب لگا سکتا ہے جسطرح ایک شہری، بلکہ بعید نہیں کہ ماہر فلکیات یا عالم کی نظر کمزور ہو، اور ایک عامی بدوی کی نظر تیز ـــــ اس صورت میں خود ماہر فلکیات یا عالم کو مسکین ان پڑھ کیطرف رجوع کرنا پڑے ـــــ الغرض شارع کے پیش نظر بیسیوں حکمتیں ہو سکتی ہیں۔ اس لئے ہمارا کام یہ نہیں کہ چوں وچرا کا سوال اٹھائیں، اور شارع سے بحث و تکرار میں مشغول ہو کر فرصت اور وقت کیساتھ دین و ایمان بھی ضائع کریں، ہمارا کام تو یہ ہے، شارع کی حکمت و شفقت پر ایک دفعہ ایمان لے آئیں، پھر اسکی جانب سے جو حکم دیا جائے اسے اپنے حق میں سراسر خیر و برکت کا موجب اور عین حکمت و مصلحت کا مظہر سمجھ کر اس پر فوراً عمل پیرا ہو جائیں۔ ـــ

زبان تازہ کردن با قرار تو
نینگیختن علت از کار تو

از جناب بریگیڈیئر گلزار احمد صاحب۔ راولپنڈی

ڈاکٹر فضل الرحمٰن کی کتاب "اسلام" پر ایک نظر

کتاب ـــــــ اسلام
مصنف ـــــــ ڈاکٹر فضل الرحمٰن سابق ڈائرکٹر مرکزی ادارہ تحقیقات اسلامی
مطبوعہ ـــــــ آکسفورڈ پریس ویڈنفیلنڈ۔ انگلینڈ
قیمت ـــــــ ۲۵/- روپے

زیرِ نظر کتاب ظاہراً نہایت عالمانہ باریکیوں کی حامل ہے۔ مگر اس میں جا بجا تاریخی حقائق کو جھٹلایا گیا ہے، اور اسلام کے متفقہ عقائد کو معنی خیز طریقے پر غلط پیش کیا گیا ہے۔ مصنف اپنی کتاب کے متعلق کہتا ہے ـــــ "بنیادی طور پر یہ کتاب واقعات پر مبنی ہے۔ اس لئے یہ واقعیت اور نگاہِ خارجی کی حامل ہے۔ البتہ اس کے بعض مقامات میں ترجمانی اور رائے کا دخل بھی ہے۔ یہ ترجمانی محض تاریخی معنوں میں نہیں اسلامی معنوں میں بھی کی گئی ہے" ـــــ اتفاق کہئے یا قصداً یہ ترجمانی اُن ابواب میں کی گئی ہے جو حضور سرورِ کائنات علیہ السلام اور قرآن حکیم سے متعلق ہیں۔ یہ دو ابواب ایمان و ایقان میں بنیادی مقام کے حامل ہیں۔ اب تک حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآنِ حکیم کے متعلق مسلمانوں میں بہت ہی کم اختلافات پائے جاتے ہیں۔ لیکن اب اندیشہ پیدا ہو گیا ہے۔ کہ اگر ڈاکٹر فضل الرحمٰن اپنے نظریات کو نشر کرنے میں کامیاب ہو گئے تو مسلمان قوم سالہا سال تک کشت و خون کے ہنگاموں کا شکار ہوتی رہے گی۔ اور جس طرح گذشتہ صدی کے بعض فتنوں نے مسلمانوں کی معتدبہ تعداد کو خارج از اسلام کر دیا تھا۔ اندیشہ ہے کہ کہیں

یہ فتنہ جدید بھی مسلمانوں کی صفوں میں مزید انتشار کا باعث نہ بن جائے۔ ستم یہ ہے، کہ یہ کتاب قاری کی توجہ اپنی طرف کھینچے رکھتی ہے۔ کچھ تو اس لئے کہ اس کا موضوع اسلام ہے۔ اور کچھ اس لئے کہ اس کتاب میں اسلام پر اس طرح کی شدید چوٹیں کی گئی ہیں۔ کہ ہر لحظہ یہ انتظار رہتا ہے۔ کہ اب اس پر کون سا چرکا لگایا جائے گا۔ یہ مصرع کہ — اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے — اگر کبھی درست آیا ہے۔ تو اس سے بڑھ کر آج تک کبھی نہیں آیا۔

اس کتاب کو پڑھنے کے بعد یہ احساس ہوتا ہے۔ کہ قوم و ملک نے جن لوگوں کو اپنے علم کے موتیوں سے گہرہائے گرانمایہ چن چن کر منظر عام پر لانے کے لئے متعین کیا تھا انہوں نے سرمایہ ملت کے ہر تابدار جوہر بے مثل کو داغدار کہہ کر غلاظت کے انبار میں پھینک دیا ہے، اور ملک وملت کے نادار عوام ایک آہ سرد لے کر خاموش ہو گئے ہیں۔ اس لئے کہ اس کتاب کو شائع ہوئے دو سال سے زائد عرصہ ہو گیا اور بہت کم لوگوں نے اس کی طرف توجہ کی۔ اسکی ایک وجہ تو یہ بھی ہو سکتی ہے۔ کہ مصنف کے عقائد کے متعلق عوام پہلے ہی سے بدظن ہیں۔ اور اس کی تصانیف کی طرف بہت کم متوجہ ہوتے ہیں، دوسری وجہ یہ تھی کہ ملک میں ایک ایسا طبقہ بھی ہے، جو ڈاکٹر فضل الرحمٰن کے مجوزہ اسلام کو اپنی لادینی سے قریب محسوس کر کے مطمئن ہو جاتا ہے، اس خیال سے کہ اب ان کی بے راہ روی اور کتاب وسنت کی کھلم کھلا خلاف ورزی پر کوئی پرسش کرنے والا نہ ہوگا۔ اس سرد مہری اور خاموشی کی ایک اور وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے۔ کہ مصنف نے اسلام کے بنیادی عقائد کو اس چابکدستی سے پامال کیا ہے کہ اگر ان کی کسی بات پر گرفت کی جائے تو وہ فلسفیانہ انداز بیان اور الفاظ کے پیچ وخم کی پناہ لے کر اپنی برئیت ثابت کرنے کی کوشش بھی کر سکتے ہیں۔ الفاظ اور بیان کا یہ کمال اس کتاب کو مزید خطرناک اور ضرر رساں بناتا ہے۔ مثال کے طور پر وحی کا ذکر کرتے ہوئے مصنف لکھتا ہے:

"قرآن خالصتہً کلام الٰہی پر مشتمل ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ یہ نہایت درجہ گہرے طور

جناب بریگیڈیر صاحب ملک کے معروف بزرگ ہیں۔ خدا نے انہیں سیف وسنان کے ساتھ قلم وقرطاس اور دینی بصیرت، ملی جذبات اور درد وسوز سے بھی نوازا ہے۔ دینی اداروں اور علمی امور سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس دینی جذبہ کی بنا پر دارالعلوم حقانیہ بھی تشریف لاتے ہیں حال ہی میں دارالعلوم تشریف آوری کے موقعہ پر انہوں نے ادارہ الحق کو رسوائے زمانہ کتاب "اسلام" پر اپنا تبصرہ پیش فرمایا جو معمولی اضافوں کیساتھ بصد شکریہ شریک اشاعت ہے۔ "ادارہ"

پیغمبر اسلام کی داخلی شخصیت کے ساتھ مربوط ہے۔ جس کا میکانکی طور پر ریکارڈ کے ساتھ تشبیہ نہیں دی جاسکتی۔ الفاظ ربانی رسول کے قلب کے راستے وارد ہوتے تھے۔" (ص ۳۲)

ملاحظہ کیا آپ نے؟ قرآن کو اللہ کے الفاظ بھی بتایا گیا ہے۔ مگر ساتھ ہی ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی داخلی شخصیت اور واردات قلب پر بھی زور ڈالا گیا ہے۔ تاکہ اگر کوئی اعتراض کرے کہ حضور سرور کائنات کی داخلی شخصیت کو قرآن کے ساتھ کیوں وابستہ کرتے ہو، تو مصنف کو یہ کہنے کا موقع ملے، کہ آپ نے میرے الفاظ ملاحظہ نہیں کئے، میں نے تو لکھا ہے ___ کہ "قرآن خالصتاً کلام ربانی ہے"

اس کتاب میں جہاں کہیں بھی اسطرح کا فتنہ اٹھانے کی کوشش کی گئی ہے، وہاں ساتھ ہی بیہودہ عقائد کا اعادہ بھی کیا گیا ہے، جس سے مجموعی طور پر پریشان کن اثر پیدا ہوتا ہے اور خطرہ محسوس ہوتا ہے کہ مذہب سے ناواقف نوجوانوں کو گمراہ کرنے کا اس سے کارگر طریقہ شاید ہی کوئی ہو سکتا ہو۔

بہتر ہوگا کہ ہم مصنف کے خیالات کو اسی تسلسل سے پیش کریں جس سے خود مصنف نے انہیں کتاب میں پیش کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں :-

"یہ خیال کہ پیغمبر وحی کے دوران حواس قائم رکھتے تھے، بہت بعد کا ہے، جسے علماء نے گھڑ لیا ہے، اس کا مقصد یہ تھا کہ وحی الٰہی کی معروضیت اور فرشتہ وحی کی خارجیت کو ثابت کیا جاسکے، یہ عقیدہ کہ جبریل کا وجود خارج میں ہے اور رسول پاک پر وحی الٰہی خارج سے نازل ہوتی ہے۔ مسلمانوں کے ذہنوں میں اس قدر راسخ ہو چکا ہے۔ کہ اب وہ حقیقت حال سے آشنا ہونے پر آمادہ نہیں"

یعنی مصنف کے خیال میں وحی اور شاعرانہ الہام میں کوئی فرق نہیں اور وحی میں کسی طرح کی خارجیت کو دخل نہیں اور جن الفاظ کو حضور نبی کریم وحی کہا کرتے تھے، یا جنہیں قرآن حکیم وحی کے ذریعے لائے ہوئے الفاظ قرار دیتا ہے۔ وہ حضور کی داخلی شخصیت کا نتیجہ تھے چونکہ داخلی شخصیت اللہ کی پیدا کردہ تھی اس لئے آپ قرآن کو اللہ کا کلام بھی کہہ سکتے ہیں۔

ـــ یہ ہے وہ استدلال جو مصنف قاری کے سامنے پیش کرتا ہے تاکہ وہ خالصتاً کلامِ الٰہی کی آڑ میں اپنی بریت بھی پیش کر سکے۔ یہی وہ مقامات ہیں جن کے متعلق یئو سوسٹی نے صدر دارالناس کہہ کے مسلمانوں کو آگاہ کیا گیا ہے۔

قرآن کے متعلق یہ کہہ چکنے کے بعد ضمناً معراج نبوی کے متعلق عامۃ المسلمین کے جو عقائد ہیں ان کی تضحیک ان الفاظ میں کی گئی ہے[1]

"معراج میں جسمانی طور پہ جانے کا جو نظریہ علماء نے من گھڑت حدیثوں کی بنا پہ بعد میں پیش کیا۔ وہ تاریخی افسانے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا اور اس کا مواد مختلف ذرائع سے حاصل کیا گیا تھا۔" (صد ۱۴)

مصنف کہنا یہ چاہتا ہے، کہ مسلمان علماء جھوٹ اور افسانہ طرازی میں بھی اس قدر نالائق تھے کہ وہ قابلِ تسلیم کہانی بھی مرتب نہ کر سکے اور جا بجا من گھڑت احادیث کا سہارا لیتے رہے۔ عوام الناس کے مذہبی عقائد ظاہری عقل سے کتنے ہی بعید کیوں نہ ہوں "فکر و نظر" کے اجارہ داروں کو یہ حق ہرگز حاصل نہیں، کہ وہ اسطرح کھلے بندوں ان کے عقائد کی تضحیک کریں خصوصاً وہ اصحابِ فکر و نظر جن کے نان شبینہ پہ خرچ ہونے والی ایک ایک کوڑی ان غریب عوام کے خون اور پسینے کی پیدا کردہ ہو۔ یہ لوگ شاید بھول گئے ہیں، کہ جن عقائد کا وہ مذاق اڑا رہے ہیں، مملکتِ پاکستان ان کی حفاظت کے لئے وجود میں آئی تھی۔ انہی عقائد کی سالمیت کیلئے لاکھوں انسانوں نے اپنی جانیں قربان کی تھیں اور اب بھی ان عقائد کی حفاظت کیلئے

---

[1] وہ امور جن سے قطعی طور پہ ثابت ہو رہا ہے کہ وحی ایک خارجی چیز تھی نہ کہ واردات قلبی؛ مثلاً جبریل علیہ السلام کا نمودار ہونا، یا دحیۃ الکلبی صحابی کی شکل میں ظاہر ہونا یا حضور اقدس پہ نزولِ وحی کے وقت خاص حالت اور کیفیت کا طاری ہونا جس سے احادیث کا تمام مستند اور معتبر ذخیرہ بھرا پڑا ہے، ڈاکٹر صاحب ان تمام واقعات کو رجعت پسندوں کی اختراع قرار دیتے ہیں۔ چونکہ معراج جسمانی سے بھی وحی کی خارجی حیثیت صاف طور پہ ثابت ہو رہی ہے۔ اس لئے ضرورت پڑی کہ "معراج جسمانی" کے عقیدے پر بھی ہاتھ صاف کیا جائے۔ ڈاکٹر صاحب نے بلا کسی دلیل و حجت کے معراج سے متعلق احادیث کے تمام مستند ذخیرہ کو من گھڑت اور افسانہ قرار دیا جس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی نگاہ میں احادیث کی کیا حیثیت ہے ۔۔۔۔! (سمیع الحق)

ملک کے دس کروڑ عوام کسی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے۔ ان مفکروں کو یہ بال کی کھال اتارنا مبارک، مگر انہیں یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اسلامی عقائد کو "تاریخی افسانہ" کہہ کر ہمارے قلوب کو مجروح کریں۔ پیغمبر جسمانی طور پر معراج کا اہل ہو سکتا ہے، یا نہیں، اس کا فیصلہ نہ مفکر نہ حکیم اور نہ عالم کر سکتے ہیں۔ یہ اعتقاد کی بات ہے اور پیغمبر کے سوا کون جان سکتا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے محبوب کو کون کون سی طاقت بخشی تھی۔؟

نبی اور قرآن

قبلۂ اوّل کی تبدیلی کے متعلق مصنّف کی رائے قابلِ توجہ ہے اس لئے کہ وہ اپنے مرکزی خیال یعنی قرآن حکیم کو کلامِ نبوی ثابت کرنے کا یہاں بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتا، وہ کہتا ہے ـــــ "مسلمان تو یہی کہے گا کہ یہ حکم پیغمبر نے نہیں دیا تھا، بلکہ اللہ نے قرآن کے ذریعہ دیا تھا، ہم قرآن اور پیغمبر کے رشتے پر دوسرے باب میں اپنے خیالات کا اظہار کریں گے، یہاں پر ہم دوسرے مسئلہ کو متاثر کئے بغیر یہ کہنے پر اکتفا کریں گے کہ ہم پیغمبر اور قرآن میں تمیز نہیں کریں گے ـــــ" ہم مصنّف کے اس فقرہ کے معنی خود اُسی سے پوچھنے کی جرأت کریں گے کہ اگر وہ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام اور قرآن میں تمیز نہیں کرتا، تو ظاہر ہے کہ وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ قرآن خود حضور کی تصنیف ہے۔ اگر وہ یہ کہنا چاہتا ہے تو پھر واضح الفاظ میں کیوں نہیں کہتا۔؟ مگر شاید ہم غلطی پر ہیں، اس نے تو اپنی طرف سے حدِ امکان تک یہ خیال پیش کر دیا ہے۔ اب قاری اپنی مرضی کے مطابق اس سے معنی نکالتا رہے جب مصنّف کے الفاظ میں وحی خیال سے الفاظ بنی ہو تو پھر مخاطبِ وحی اور وحی کے ماحصل میں فرق نہیں رہتا۔

مصنّف آگے چل کر اسلام کو "تحریکِ محمدیہ" کا نام دیتا ہے۔ یہ نام بھی بے وجہ نہیں دیا جا سکتا۔ قرآن کے متعلق مصنّف کے الفاظ یہ ہیں :-

"زندگی کی اتھاہ گہرائیوں سے ایک آواز بلند ہو رہی تھی جو بڑی شدت سے پیغمبر کے ذہن پر دباؤ ڈال کر اپنے آپ کو شعور کی سطح پر واضح کر رہی تھی ـــــ"

یعنی قرآن رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے غور و فکر کا نتیجہ تھا۔ اس کے بعد مصنّف یہ کہتے ہوئے نہیں جھجکتا کہ :

"قرآن کا متن کئی جگہ پر واضح طور پر یہ کہتا ہے کہ وہ محض معناً نہیں بلکہ لفظاً نازل ہوا ہے۔"

اس سے شاید باور کرانا چاہتا ہے کہ وہ قرآنی دعوے سے واقف ہوتے ہوئے بھی اپنے عقیدے پر مضبوطی سے قائم رہنا چاہتا ہے۔ بلکہ مصنف کو اصرار ہے کہ قرآن کی خارجیت کا عقیدہ علماء نے صدیوں بعد گھڑ کر مسلمانوں میں رائج کیا۔ مصنف کو اپنی ذہنی بلندی پر ناز ہے، وہ علماء سلف کو اپنا ہم پلہ نہیں سمجھتا۔ اُس کے الفاظ میں :-

"علماء کے ذہن اتنے ترقی یافتہ نہ تھے (ان کے پاس ذہنی اوزار موجود نہ تھے) کہ وہ یہ دونوں باتیں کہہ سکتے کہ قرآن پورے کا پورا کلام اللہ ہے اور چونکہ اُسے پیغمبر کی دینی شخصیت اور عمل کے ساتھ بھی نہایت عمیق تعلق ہے اس لئے پورا کا پورا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا کلام بھی ہے۔ یہ واضح رہے کہ قرآن ان دونوں باتوں کو مانتا ہے۔ کیونکہ جب وہ اس امر پر اصرار کرتا ہے کہ قرآن کا نزول قلب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر ہوا ہے۔ تو وہ آپؐ سے ایک خارجی چیز کیسے ہو سکتا ہے۔؟"

ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ مصنف یہ الجھا ہوا نظریہ جان بوجھ کر پیش کر رہا ہے۔ یا وہ صمیم قلب سے اس نظریہ کا قائل ہے۔ قرآن قلب پر نازل ہوا یا ذہن پر۔ لفظ "نزول قرآن" سے ظاہر ہے۔ کہ وہ خارج سے اترا ہے۔ خصوصاً جب جبریلؑ کے وجود سے انکار نہیں کیا جا سکتا تو پھر رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی دینی شخصیت کس طرح اسکی موجب بن سکتی ہے۔ اگر کسی شے کو حضورؐ کی شخصیت سے تعلق ہو سکتا ہے تو وہ حدیث اور سنت نبوی ہے۔ یعنی آپؐ کے اقوال افعال ہی ہیں۔ تعجب آتا ہے تو اس بات پر کہ مصنف خود ہی تسلیم کرتا ہے۔ کہ قرآن وحی کو از خارج قرار دیتا ہے۔ مگر یہ تسلیم کرنے کے باوجود وہ یہ کہتا ہے کہ ـــــ "وحی کا از خارج ہونا علماء کی اختراع ہے جنہوں نے غلط تفاسیر اور من گھڑت احادیث کے ذریعہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے"ـــــ سوال یہ ہے کہ اگر قرآن وحی کو "از خارج" قرار دیتا ہے۔ تو پھر علماء کے اختراع کے کیا معنی۔؟ ہاں یہ ہو سکتا ہے۔ کہ اگر مصنف قرآن کو سرے سے کلام الٰہی تصور ہی نہیں کرتا اور اُسے تصنیف نبوی قرار دیتا ہے۔ تو پھر وہ یہ کہہ سکتا ہے کہ قرآن کے اندر جو ایسی آیات ہیں جن سے وحی کی خارجیت واضح ہوتی ہے وہ بھی چونکہ تصنیف نبوی ہیں۔ اس لئے وہ نعوذ باللہ وحی کو یعنی قرآن کو الفاظ ربانی کا درجہ نہیں دے سکتیں۔ اگر مصنف یہی کچھ کہنا چاہتا ہے تو اُسے چاہیئے کہ

وہ مملکت پاکستان کے خزانہ عامرہ سے تنخواہ لینا بند کر دے، اور اپنے خیالات کی تبلیغ کے لئے ایک عام شہری کی حیثیت اختیار کرے۔

مصنف آگے چل کر قرآن کو "احساس خیال اور الفاظ" بتاتا ہے۔ یعنی قلب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) میں احساس پیدا ہوتا تھا، اس سے ان کے ذہن میں خیال کے خدوخال اُبھر آتے تھے اور پھر یہی خیال الفاظ کا جامہ پہن لیتا تھا۔۔۔ اس کے بعد کا فقرہ بھی قابل غور ہے:

"حبیب محمد کا اخلاقی وجدانی ادراک بلند ترین مقام پر پہنچ کر اخلاقی قانون کا مقام پا لیتا تھا۔ تو الہام (وحی) کے ساتھ ہی ساتھ لفظ بھی دے دیا جاتا تھا۔"

ہم حضور سرور کائنات کی "اخلاقی الہامی نظر" کی بلندی اور پھر از خود "اخلاقی قانون کا مقام حاصل کر لینے کے معنی سمجھنے سے قاصر ہیں۔ صرف اتنی بات سمجھ میں آتی ہے کہ مصنف کے خیال میں حضور کی داخلی کیفیت وحی پر منتج ہوا کرتی تھی اور الفاظ از خود مل جاتے تھے، لیکن ہم مصنف سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ اگر وحی و قرآن حضور کی داخلی کیفیت اور اخلاقی الہامی نظر کی بلندی کا نتیجہ ہے۔ تو پھر "محمد الرسول اللہ" کے کیا معنی ہیں۔؟[1] ہمیں امید ہے کہ اگر مصنف کے پیش نظر صرف ہمارے دین کا مذاق اڑانا نہیں تو بالغ نظری سے کام لیتے ہوئے ہمارے اس سوال کا جواب نہایت سنجیدگی اور ایمانداری سے دیا جائے گا۔ اور فلسفیانہ زبان و بیان سے احتراز برتا جائے گا، واضح رہے کہ ہم یہ نہیں سننا چاہتے کہ ہماری محدود ذہنی صلاحیت اس پیچیدہ مسئلہ کو سمجھنے سے قاصر ہے، اس لئے کہ ہمارا ذہن اللہ کا عطا کردہ ہے۔ اُس اللہ کا جس نے

---

[1] ڈاکٹر صاحب اور ان کے ہم خیال متجددین مغرب زدہ لوگ عموماً چند "ابدی حقیقتوں" اور "اخلاقی قوانین" کی آڑ میں اسلام کا حلیہ بگاڑتے ہیں۔ ان لوگوں کے نزدیک یہ ابدی حقائق مثلاً انصاف، مساوات، احترام انسانیت ہر دور میں اچھے سمجھے گئے ہیں اسلام ان ہی ابدی حقائق کا نام ہے، حالانکہ شریعت وحی اور رسالت کے بغیر یہ ابدی حقیقتیں صرف اضافی حیثیت رکھتی ہیں۔ دنیا کے کچھ لوگ اور ریفارمر جس چیز کو اخلاقی قانون سمجھتے ہیں عین اسی وقت دنیا کی دیگر اقوام اور مصلحین ان قوانین کو ظلم بربریت اور برائیوں کا نام دیتے ہیں۔ اسلام تعلیمات آسمانی کو اصل قرار دیتا ہے، اور اسے اخلاقی اور ابدی صداقتوں کا معیار نہ کہ بنی کا موجودہ صداقتوں سے اتفاقیہ تطبیق کو اخلاقی قوانین اور وحی کہہ دیا جائے۔
(سمیع الحق)

پیغمبر آخرالزمان نبی کریم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کو وحی کے ذریعے اس لئے اپنے الفاظ میں نازل کیا تھا۔ کہ اس کا تخلیق کردہ انسان اس کے فرستادہ پیغام کو بہ آسانی سمجھ سکے اور اس پر عمل کر سکے۔

مصنف اس داخلی کیفیت کے ذریعہ قرآن کو کلام رسول ثابت کرنے کے لئے طرح طرح کا استدلال پیش کرتا ہے اور ایک جگہ تو حد سے گزر جاتا ہے، جب وہ کہتا ہے — "وہ ایسا آدمی ہے جو فطرتاً لوگوں اور ان کے مطمع نظر کی طرف سے بے خبر ہے اور تاریخ کو از سر نو استوار کرنا چاہتا ہے۔" — ہم اس طرز بیان کو گستاخانہ تصور کرتے ہیں۔ وہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم جن کا قول ہے: "لی خرقتین الفقر والجہاد" تاریخ کو از سر نو استوار کرنے کی آرزو نہیں رکھ سکتے۔ تاریخ کو اپنے مقاصد کے لئے وہ لوگ استعمال کرنے کے آرزومند ہوتے ہیں۔ جن میں نام و نمود یا دولت کی خواہش ہو مگر جسے اللہ پکار کر کہہ رہا ہے۔ "یاایھا المدثر قم فانذر" وہ از خود بے صبری نہیں دکھاتا اور نہ ہی اپنی طرف سے تاریخ کو از سر نو ترتیب دینے کی کوشش کرتا ہے۔ مصنف شاید انگریزی زبان و بیان پر اپنی قدرت دکھانے کی رَو میں یہ سب کچھ کہہ گیا ہے اور اُسے حضورؐ سرور کونین کی شان میں گستاخی کا خیال نہ تھا، گو عظمت رسول کے احساس کا فقدان تو اس امر سے ظاہر ہے کہ ساری کتاب میں حضورؐ کے نام کے ساتھ صلوٰۃ والسلام کہیں نہیں۔

احساس خیال اور الفاظ سے چونکہ مصنف یہ بتانا چاہتا ہے کہ قرآن تصنیف نبویؐ ہے۔ اس لئے قدرتی طور پر اس کے لئے دوسرا قدم صرف یہی ہو سکتا تھا کہ وہ کہے کہ فرمان نبوی کو دوام حاصل نہیں ہو سکتا۔ مصنف نے ان الفاظ میں تو نہیں کہا، البتہ اپنے مخصوص فلسفیانہ انداز میں اس خیال کا اظہار ضرور کر دیا ہے۔ وہ کہتا ہے:

"اس سے صاف ظاہر ہے کہ قرآن کے قوانین خود قرآن کی رُو سے دوامی نہیں ہو سکتے۔"

جہاں تک ہمارا علم ہے۔ آج تک کسی مسلمان نے یہ نہیں کہا کہ قرآن کے احکام خصوصاً اس کے قوانین دوامی نہیں۔ مسلمان گنہگار ہوتے ہوئے بھی اور اپنے گناہوں کو تسلیم کرتے ہوئے بھی کبھی اس ارتداد کے مجرم نہیں ہوئے کہ وہ تجاوز کر کے احکام و قوانین قرآن کو ہی منسوخ کہہ دیں۔ قرآن کے قوانین اول تو ہیں ہی گنتی کے۔ شادی بیاہ، طلاق وراثت اور چند کبیرہ

گناہوں کی سزاؤں کے علاوہ قوانین بہت کم ہیں۔ مصنف کے اس خیال کو اگر منطقی حدود تک لے جایا جائے تو پھر معاشرے میں فساد و انتشار کی کوئی حد نہیں رہ جاتی۔ اس فتنۂ عظیم کی تہ میں جو خواہش مضمر ہے، وہ چھپی نہیں رہ سکتی۔ مصنف کا استدلال ایک بار پھر ملاحظہ ہو:

"قرآن کلام الہٰی ہے مگر اسی حد تک کلام نبوی بھی"

پھر

"یہ (قرآن) دوامی ہے۔ مگر اپنی قانونی حیثیت میں پوری طرح دوامی نہیں۔"

یعنی چونکہ نعوذ باللہ یہ کلام نبوی ہے اور دوامی نہیں اس لئے حکیمانہ نظر رکھنے والے جب چاہیں اس کے احکام اور قوانین کے خلاف قانون وضع کر سکتے ہیں اور اپنے آپ کو مسلمان کہلانا یا کہنا بھی جاری رکھ سکتے ہیں۔

حدیث و سنت پر اب تک جو حملے ہو رہے تھے مسلمان اُن ہی سے نہ نمٹ پائے تھے کہ فکر و نظر" رکھنے والوں نے اب قرآن کو بھی اپنا ہدف بنانا شروع کر دیا ہے۔ احادیث کے متعلق مصنف کا نظریہ چھپا ہوا نہیں، وہ جا و بیجا حدیث پر حملہ کرنے سے نہیں چوکتے۔ دراصل جو شخص قرآن کے مقام کو کم کرنا چاہے اُسے حدیث کا احترام کیسے ہو سکتا ہے۔ اب تک قرآن کے کلام اللہ ہونے کا اگر کوئی ثبوت تھا تو وہ قول نبوی تھا، چونکہ حضورؐ نے بار بار فرمایا ہے کہ قرآن کلام الہٰی ہے جو وحی کے ذریعہ ان پر نازل ہوا ہے۔ اس لئے اسے کلام اللہ کا درجہ دیا گیا۔ اب جو قرآن سے اس کا یہ مقام چھیننا چاہے اُس کے لئے

لہ قرآن مجید کے معاشرتی، معاشی اور سیاسی قوانین اور ضوابط کے متعلق ڈاکٹر صاحب نے بارہا کہا ہے کہ اس میں حالات کے مطابق تبدیلی کی جا سکتی ہے۔ ایسے معاشرتی امور کیلئے ڈاکٹر صاحب نے تعدد ازدواج کی مثال بھی پیش کی ہے (صـ ۲۹) انہوں نے اس مسئلہ کے دور از کار تاویلات کے بعد اسی کتاب میں اصولی طور پر یہ نتیجہ نکالا ہے کہ "قرآنی قانون انسانی آزادی کی ترقی پسندانہ بنیادی اقدار کے رخ کی نشاندہی کرتا ہے۔ اور اس ضمن میں نئی قانون سازی کی ذمہ داری ظاہر کرتا ہے۔ تاہم قرآن کے اصل ضابطے میں اسی عہد کے معاشرے کو بطور دائرہ کار قبول کرنا پڑا! اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید کے اصل ضابطے قرآن ہی کی نظر میں لفظی اعتبار سے ابدی نہیں ہو سکتے۔ صـ ۳۹

(سمیع الحق)

ضروری ہے کہ پہلے حدیث کو ناقابل اعتبار قرار دے چونکہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن اور حدیث کو غلط ملط ہونے سے بچانے پر از حد زور دیا تھا اس لئے جدت پسند حدیث کی اہمیت کو سرے سے کم کرنے کی کوششوں میں سرگرداں ہیں مگر حدیث کی اہمیت اسطرح کی کوششوں سے کم نہیں ہو سکتی۔ بہرحال ہمیں خوشی ہے کہ مصنف سرے سے حدیث کا منکر نہیں۔ اس کے الفاظ ہیں :-

"اگر حدیث کو سرے سے نظر انداز کر دیا جائے تو قرآن کی تاریخی بنیاد یک قلم ختم ہو جاتی ہے"

اس فقرے میں بھی "قرآن کی تاریخی بنیاد" کی حفاظت ملحوظ رکھی گئی ہے، قرآن کے کلام اللہ ہونے کی دلیل کو پیش نہیں کیا گیا۔ شاید اس لئے کہ اس کتاب کا مقصد ہی یہ تھا کہ قرآن کو کلام تو کہہ کر اسکی دائمی قانونی حیثیت کو ختم کیا جائے اور پھر اللہ کی قائم کردہ حدود سے تجاوز کو قانونی مقام دے دیا جائے۔ ہمیں یقین ہے کہ مصنف خود بھی کلام اللہ کی اکثر حدود کو توڑنے سے ہچکچائے گا۔

مصنف نے جا بجا علماء کے کردار پر حملے کئے ہیں۔ علماء اور فلاسفروں کے درمیان جو اختلافات رہے ہیں ان کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسی طرح علماء اور صوفیاء کے اختلافات کو بھی غیر حقیقی رنگ دینے کی کوشش کی ہے۔ ان رنگ آمیزیوں کا مقصد صرف یہ تھا کہ مسلمانوں کے دلوں میں علماء کے متعلق جو احترام اور قدر و منزلت موجود ہے وہ کم ہو جائے۔ اور مسلمان نئی تحریکوں کو قبول کرنے میں حیل وحجت نہ کریں۔ کہیں علماء پر احادیث گھڑنے کا الزام ہے، کہیں عقلیت دشمنی کا، کہیں انہیں قانون کے پرستار اور کسی جگہ تنگ نظر اور متعصب بتایا ہے ___ علماء اور صوفیاء کے درمیان روابط سے مصنف یہ اخذ کرتا ہے۔ کہ اسلام ہمیشہ اپنے اندر تبدیلیاں قبول کرتا رہا ہے۔ اس لئے علماء کو چاہیئے کہ وہ اب بھی اسلام کے اندر تبدیلیاں آنے دیں۔ لیکن مصنف بھول جاتا ہے کہ ماضی میں فلاسفر جو تبدیلیاں لانا چاہتے تھے۔ وہ خارجی اثرات کی پیداکردہ تھیں اور اسی لئے ان کو رد کر دیا گیا تھا۔ آج عقلیت کے پرستار اور نئی روشنی کے چاہنے والے جو تبدیلیاں عریانی اور آوارہ روی کی شکل میں لانا چاہتے ہیں وہ بھی خارجی اثرات کا نتیجہ ہیں، اور اسی لئے علماء نہایت سختی سے ان کے خلاف آواز بلند کرتے رہتے ہیں۔ مصنف کہتا ہے کہ "تاریخ کی نئی ترجمانی کیساتھ

انصاف کرنے کے لئے ضروری ہوگا کہ وحی کے متعلق اعتقادات کو تبدیل کیا جائے۔"

ہم مصنف کو یقین دلاتے ہیں کہ تاریخ کی نئی ترجمانی جتنی بھی اہم کیوں نہ ہو مسلمان وحی اور قرآن کے متعلق اپنے اعتقادات کبھی نہیں بدلیں گے۔ اس لئے کہ جب یہ اعتقادات بدل جائیں گے، تو پھر وہ کسی اور دین کے پیرو ہو جائیں گے۔ مسلمان نہیں رہیں گے۔ مسلمان ہر زمانے میں قرآن و سنت کے متعلق چوکنا رہے ہیں۔ اس لئے کہ ہر دور میں ایسے لوگ پیدا ہوتے رہے ہیں۔ جن کے متعلق قرآن کریم کا ارشاد ہے: وان الشیاطین لیوحون الی اولیاءھم لیجادلوکم (الانعام)

بقیہ: یادرفتگان رہا ہے۔ حوصلے اور امید باندھنے کے لئے صرف یہی ایک چیز رہ گئی ہے۔ — مولانا مبارک علی مرحوم سے چند دن قبل دارالعلوم کے ایک اور استاذ شیخ الہندؒ کے تلمیذ اور خادم مولانا عبدالجلیل بھی وفات پاگئے۔ اور اسی طرح عالم اسلام کے ممتاز مفکر اور داعی مولانا ابوالحسن علی ندوی کی والدہ ماجدہ مرحومہ (جن کا وجود علم وفضل اور زہد و تقویٰ کا ایک نادر نمونہ تھا۔) بھی انتقال کر گئیں۔ — خداوند کریم سب حضرات کو بہترین مقام قرب و رضا سے نوازے اور پسماندگاں کو صبر نصیب ہو۔

مضمون نگار حضرات کی خدمت میں گذارش ہے کہ الحق کیلئے لکھے جانے والے مضامین کا مسودہ تیار کرتے وقت یہ خیال رکھا جائے کہ (۱) مسودہ کاغذ کے ایک طرف لکھا جائے۔ (۲) مسودہ میں الفاظ واضح اور مرتب ہوں۔ (۳) عربی اور فارسی الفاظ شکستہ خط میں نہ لکھے جائیں — مسودہ اگر ان اصولوں کے مطابق تیار کیا گیا ہو تو مضامین کی عمدہ ترتیب اور دیدہ زیب کتابت میں بڑی مدد ملتی ہے۔ امید ہے مضمون نگار حضرات الحق کی ظاہری خوبیاں برقرار رکھنے میں پورا پورا تعاون فرمائیں گے۔ "ادارہ"

الحق کو ہم ہر ممکن احتیاط کے ساتھ ہر ماہ تمام خریداروں کی خدمت میں ارسال کرتے ہیں۔ پھر بھی کافی حضرات کی طرف سے شکایتی خطوط آتے ہیں۔ ایسے حضرات کو رسالہ دوبارہ بھیج دیا جاتا ہے، ہمیں افسوس ہے کہ محکمۂ ڈاک کی اس بدنظمی کا ہمارے پاس کوئی علاج نہیں پھر بھی جہاں تک ممکن ہے ہم شکایات دور کرنے میں کوشاں ہیں۔ "ادارہ"

یادِ رفتگان

(سمیع الحق)

پچھلے پرچہ میں دارالعلوم دیوبند کے نائب مہتمم مولانا مبارک علی صاحب مرحوم کی خبرِ وصال کی اطلاع دی جا چکی ہے۔ موصوف کا وجود دیوبند کی روایات اور صفات کا حسین پیکر تھا۔ بے مثل عالم، وسیع النظر فقیہ اور مفتی، جید مدرس اور اس کے ساتھ ہی عابد مرتاض متقی اور فرشتہ سیرت انسان تھے۔ حضرت شیخ الہندؒ سے تلمذ رہا، اور مدتوں حاضر باش خادم بھی رہے اور ان کی سیاسی تحریک "ریشمی رومال" میں بھی نمایاں کام کیا۔ ۱۳۵۰ھ سے دارالعلوم کے نائب مہتمم ہوئے، اور وصال تک بے لوث اور بے مثال خدمت انجام دی۔ تاریخ دارالعلوم میں ان کا مقام بہت اونچا رہے گا۔ راقم کو ۱۹۴۲ء میں پہلی بار کمسنی کے زمانہ میں ان کی زیارت کا شرف حاصل ہوا، جبکہ وہ اکوڑہ خٹک تشریف لائے اور دو چار دن یہاں قیام رہا۔ گو آپ بہت کم گو اور خاموش طبع انسان تھے مگر اتنا یاد ہے کہ اس دوران آپ نے دارالعلوم حقانیہ کے طلباء سے خطاب بھی فرمایا۔ اس کے بعد ۱۹۶۰ء میں جبکہ ۸، ۱۰ دن دارالعلوم دیوبند رہنے کی سعادت نصیب ہوئی تو حضرت کی صحبت اور خصوصی شفقت پائی۔ حضرت شیخ الحدیث دارالعلوم حقانیہ سے ان کے زمانۂ قیامِ دیوبند سے لیکر اب تک نہایت مخلصانہ شفقانہ تعلق رہا۔ ان تعلقات اور روابط کی بناء پر حضرتؒ کا وصال ایک گونہ ذاتی صدمہ ہے۔ مگر پورے علمی حلقہ بالخصوص دارالعلوم دیوبند کے لئے تو اس لحاظ سے صدمے کا احساس شدید ہو جاتا ہے کہ حجۃ الاسلام محمد قاسمؒ کی بچھائی ہوئی بساطِ علم و فضل بڑی تیزی سے لپٹی جا رہی ہے۔ اور جانے والوں کی جگہ پُر نہیں ہو رہی۔ حجۃ الاسلامؒ کی مسندِ علم کو حضرت شیخ الہندؒ نے آباد رکھا۔ حضرت شیخ الہندؒ کی مجلسِ علم و فضل اور مسندِ جہاد و عزیمت کو حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنیؒ نے آراستہ رکھا، داعیٔ کبیر مولانا الیاسؒ کے مقامِ دعوت و ارشاد کو امیر التبلیغ مولانا یوسفؒ نے سنبھالا دیا۔ شبلیؒ کی مسندِ کمال پر سلیمانؒ ندوی جلوہ افروز ہوئے، تھانہ بھون کی خانقاہ امدادیہ کے فیض کو حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے کمال تک پہنچایا۔ خانقاہ رائے پور کی رونق مولانا عبدالقادرؒ سے قائم رہی اور ذرا پیچھے کی طرف نگاہ دوڑائیں تو حکیم الاسلام شاہ ولی اللہؒ کا دور نظر آئے گا، جو علمی عروج کا زمانہ تھا۔ وہ جب گئے تو اپنے پیچھے شاہ عبدالعزیزؒ، شاہ عبدالقادرؒ، شاہ اسمٰعیلؒ اور سید احمد شہیدؒ جیسے روحانی اخلاف رشید چھوڑ کر گئے۔ مگر اب تو یہ چیز عنقا نظر آتی ہے، علم علماء کے اٹھ جانے سے اٹھتا جا رہا ہے۔ علمی اضمحلال اور قحط الرجال کا یہی عالم رہا تو معلوم نہیں اگلی نسلوں کا کیا بنے گا۔ مگر حفاظتِ دین کی غیبی دستگیری کا جو سلسلہ اب تک چلا آ

(باقی ص ۶۰ پر)